چونکا دینے والی دلچسپ اور خوفناک کہانیوں کا انتخاب

سہ ماہی

شاہین ڈائجسٹ

سلانوالی، سرگودھا

جون 2017



چونکا دینے والی دلچسپ اور خوفناک کہانیوں کا انتخاب

سہ ماہی شاہین ڈائجسٹ

سلانوالی، سرگودھا

جلد نمبر 01 شمارہ نمبر 03 جون 2017

Shaheendigest786@gmail.com



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ شاہین ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں۔ کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔

قرآن کی باتیں

☆ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں (نہیں) بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے۔ پاکیزہ کرتا ہے۔اوران پر دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔(سورۃ نساء 4 آیت 49)

☆ جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں۔اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں۔ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جذیہ دیں۔(سورۃ توبہ 9 آیت 19)

☆ (اے محمدﷺ) عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔(سورہ اعراف 7 آیت 199)

☆ اس کے پیچھے دوزخ ہیا ور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا وہ اس سے گھونٹ گھونٹ پئے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا اور ہر طرف سے اسے موت آرہی ہوگی مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا اور اس کے پیچھے سخت عذاب ہوگا۔(سورۃ ابراہیم 14 آیت 16 سے 17)

☆ بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی کے کہیں حریص دیکھو گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی۔ان میں سے ہر ایک یہی خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ ہزار برس جیتا رہے مگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھڑا سکتی اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔(سورۃ بقرہ 2 آیت 96)

☆ اے اہل کتاب! تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ غلط ملط کیوں کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو اور تم جانتے بھی ہو۔(سورۃ آل عمران 3 آیت 71)

ضروری بات

السلام علیکم!

تمام قارئین اور رائٹرز حضرات سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہماری انتھک محنت کے باوجود ہم فی الوقت اس رسالے کو کتابی شکل میں لانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمارا وکیل لائسنس کے لیے بھرپور محنت کر رہا ہے۔ جیسے ہی ہمیں لائسنس ملتا ہے۔ انشاء اللہ بفضل خدا ہم اس رسالے کو بہر صورت کتابی شکل میں لائیں گے۔ غیر قانونی طریقے سے رسالہ شائع کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ قارئین کرام سے ایک بار پھر معذرت چاہتے ہیں کہ اب جیسے ہی لائسنس جاری ہوا اس کے بعد رسالے کو کتابی شکل میں لانے کا اعلان کیا جائے گا۔ ہمارا مقصد کسی کو ایذاء پہنچانا یا کسی کی دل آزاری کرنا مقصود نہیں تھا۔ والسلام

بانی و چیف ایڈیٹر

ملک این اے کاوش اعوان

0302-2305767

ایڈیٹر

محمد ندیم عباس میواتی (پتوکی)

0306-9034595



کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ابراہم نخعیؒ کے پاس بیٹھا تھا اور وہ قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔اچانک ایک شخص نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو ابراہیم نخعیؒ نے فوراً قرآن پاک پر کپڑا اٹال دیا اور اسے چھپادیا اور کہنے لگے کہ وہ دیکھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں ہر وقت قرآن ہی پڑھتا رہتا ہوں۔ابراہیم نخعیؒ کی بیوی بیان کرتی ہے کہ یہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن روزہ نہ رکھتے یعنی صوم داؤدی کا معمول تھا جیسے احادیث رسول ﷺ میں سب سے افضل اور بہتر قرار دیا گیا ہے۔زہدوتقویٰ اور پرہیز گاری کا یہ حال تھا کہ شکوک وشبہات کے مواقع سے بچتے بیوی کا جب انتقال ہوا تو اس کا جو مال تھا اس کے گھر والوں کو دے دیا کہ اس کے ورثاء میں تقسیم کردیا جائے۔ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم کو اس نے ہبہ نہیں کیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں کیا تو تھا لیکن وہ بیمار تھی اور اس حال میں ھبہ کا کیا اعتبار۔

ایک مرتبہ سواری کیلئے جانور کرایہ پر لیا راہ چلتے ہوئے کوڑا ہاتھ سے گر گیا سواری سے اتر کر اسے باندھا اور پیچھے پلٹ کر پیدل گئے اور کوڑا اٹھایا لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ اگر سواری کو موڑ کر پیچھے لے جاتے اور اس جگہ اتر کر اٹھا لیتے تو کیا یہ آسان نہ تھا جواب میں کہنے لگے ”میں نے جانور کو اس طرف کرایہ کیلئے لیا ہے نہ کہ پیچھے کی طرف“ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے سلف وصالحین کا یہ حال تھا کہ ان میں جب کوئی جنازہ ہوتا تو کئی دن تک غمگین رہتے کہ ان کے چہروں سے غم ظاہر ہوتا تھا۔ایک مرتبہ لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم جب کسی جنازہ میں شریک ہوتے ہیں یا کسی کے انتقال کی خبر سنتے ہیں تو کئی دن تک ہم پر اس کا اثر رہتا ہے کیونکہ اب وہ ایسی جگہ پہنچ گیا ہے۔جہاں اس کیلئے جنت ہے یا دوزخ اور تم لوگوں کا یہ حال ہے کہ تم اپنے جنازوں میں بھی دنیاوی باتیں کرتے ہو۔ایک شخص پہلے اچھی حالت میں تھا۔پھر اس

جگہ بگاڑ آ گیا تو اس کے ساتھیوں نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ ابراہیم نخعیؒ تک یہ بات پہنچی تو کہنے لگے "اس کو نصیحت کرو اصلاح کی کوشش کرو اور اس سے قطع تعلق نہ کرو" خود ان کی عادت یہ تھی کہ کسی کے اندر کوئی برائی اور کمزوری دیکھتے تو اصلاح کی کوشش کرتے اور نصیحت کرتے لیکن برائی کی وجہ سے اس کی تحقیر نہ کرتے نہ اسے عار دلاتے اور نہ برائی کے ساتھ اس کا ذکر کرتے اس ڈر سے کہ کہیں میں خود اس برائی میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔

انتقال سے قبل رونے لگے لوگوں نے وجہ پوچھی فرمایا" کیسے نہ روؤں؟ ملک الموت کا انتظار کر رہا ہوں پتہ نہیں وہ مجھے جنت کی خوش خبری دے گا یا جہنم کی؟" بیماری کی شدت بڑھ گئی تو زبان پر کلمہ توحید کا ورد تھا اسے پڑھتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔(انا اللہ و انا الہ راجعون)



جمیلہ نے غربت ،تنگدستی اور مجبوریوں کی چکی میں پستے ہوئے گھر میں آنکھ کھولی۔ان دنوں اس کے والدین بے شمار پریشانیوں میں مبتلا تھے۔اس کی ماں ایک ساتھ کئی بیماریوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔اس کا باپ جلال بیوی کا ہر حال میں خیال رکھتا تھا۔جب بھی بیوی کی طبیعت ناساز ہوتی وہ نجانے کہاں سے بھاری رقم لے آتا اور اپنی بیوی کا علاج کرواتا۔وقت یوں ہی گزرتا جا رہا تھا۔

جمیلہ کی عمر جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی۔جلال کی پریشانیوں میں ویسے ویسے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔انہی پریشانیوں کی گود میں پلتی جمیلہ پر ایک دن بم گرا اور وہ اپنی ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا۔وہ بہت چھوٹی تھی اور یہ حادثہ اس کے لیے بہت

بڑا تھا۔جس کی وجہ سے معصوم جمیلہ کو چپ سی لگ گئی۔

دوسری طرف جلال کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ گھر کے کام کاج کون سنبھالے گا اور اس کی معصوم دھی کا کون خیال رکھے گا؟ پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایسے حالات میں جمیلہ اپنی پھوپھی کے گھر رہنے لگی۔جلال صبح مزدوری پر جاتا اور شام گئے لوٹ آتا۔اس کو کھانا وغیرہ بہن کے گھر سے مل جاتا تھا مگر کب تک؟

یہی پریشانی اسے کھائے جا رہی تھی۔آئے دن اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔دکھ، پریشانیاں اور مصیبتیں اس کے گھر پر ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔اس کے دن کا چین اور راتوں کی نیند غارت ہو کر رہ گئی تھی۔بیوی کی جدائی کا دکھ اور بیٹی کی تنہائی کا غم اسے ناگ کی مانند ڈستا تھا۔وقت بہت بڑا مرہم ہے۔دھیرے دھیرے ہر غم کو بھلا دیتا ہے۔ایسے ہی دھیرے دھیرے جلال کی زندگی بھی معمول پر آ گئی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ جلال کے رشتے داروں اور دوست احباب نے اس پر زور دینا شروع کر دیا کہ بہن کے گھر سے کھانا پینا بھائیوں کو زیب نہیں دیتا اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنا دوبارہ گھر بسا لے۔انکار کرتے کرتے آخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے اور پھر اپنے خاندان میں ہی رشیدہ نامی ایک بیوہ سے اس نے شادی رچا لی۔جس مقصد کے لیے جلال نے شادی کی تھی۔وہ پھر بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔رشیدہ نے آتے ساتھ ہی جمیلہ کو گھر لانے سے منع کر دیا۔حالات زیادہ خراب ہو گئے تو جلال کی بہن نے جمیلہ کو اس کے گھر بھیجنے سے انکار کر دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ رشیدہ چار بچوں کی ماں بن گئی۔تبھی ایک روز پھر رشیدہ کی طبیعت کافی خراب ہوگئی تو نجانے اس کے ذہن میں کیا آیا۔اس نے جلال سے جمیلہ کو گھر لانے کا کہا تو وہ حیران رہ گیا۔جلال تو یہ

بات سن کر پھولے نہ سمایا اور فوراً ہی جا کر جمیلہ کو لے آیا۔

جمیلہ اب سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر تھی۔رشیدہ کا اس کے ساتھ رویہ کافی حد تک برا تھا۔وہ جنون کی حد تک خودغرض تھی۔بات بات پر جمیلہ کو ڈانٹ کر اس کی بے عزتی کر دیتی۔جمیلہ چپ چاپ سب کچھ سہہ جاتی۔کبھی کبھی وہ خلوت میں بیٹھ کر خون کے آنسو رو لیتی۔

جمیلہ کو گھر کے سارے کام کاج کرنے پڑتے تھے۔اسے کھانے کے لیے بہت کم ملتا اکثر و بیشتر تو اسے باسی کھانا کھانا پڑ جاتا۔

رشیدہ بہت مکار تھی۔وہ دو روپ اختیار کیے ہوئے تھے۔جلال کے سامنے اس کی بیٹی کے ساتھ سگی ماں بن جاتی اور اس کی موجودگی میں ناگ بن کر اسے ڈستی۔

ایک دن قسمت کی ماری جمیلہ نے رشیدہ کو ماں کیا کہہ دیا۔اس نے جمیلہ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ جمیلہ کا بہت دل کرتا تھا کہ وہ بھی اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسے کھیلےلیکن جمیلہ اسے ان کے قریب بھی نہ بھٹکنے دیتی تھی۔

ایک دن رشیدہ کسی کام میں مصروف تھی تو جمیلہ کا جی چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو گلے لگا کے پیار کرے۔جیسے ہی وہ چوری چھپے اپنے بھائی کو گلے لگانے کے لیے آگے بڑھی اتفاق سے رشیدہ نے اسے دیکھ لیا۔پہلے رشیدہ نے اس کی خوب پٹائی کی اور پھر اسے کمرے میں بند کر دیا اور جلال کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے نکال کر ایک بار پھر اس بیچاری کی نہ صرف پٹائی کی بلکہ اسے سختی سے متنبہ بھی کیا کہ اگر اس نے باپ سے کچھ کہا تو وہ اسے زندہ جلا ڈالے گی۔

ایک دن جمیلہ اپنے گھر کے کام کاج میں مصروف تھی کہ اچانک اس کے گھر میں اس کا ماموں داخل ہوا۔اس نے اپنے ماموں کو جیسے ہی سامنے دیکھا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔جمیلہ نے جلدی سے اٹھ

کرڈوپٹہ اٹھایا اور اپنے ماموں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ماموں نے اسے گلے لگایا تو اس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔

''بس بیٹا بس۔'' اس کا ماموں اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔

''تمہارے بھائی (ماموں زاد) کی شادی ہے۔ بیٹا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے نئے کپڑے بھی لایا ہوں۔''

ماموں نے اسے کپڑے تھمائے تو وہ جھٹ سے تیار ہو گئی اور ماموں کے ساتھ چلی گئی۔ دوسری طرف جلال گھر آیا تو اس نے رشیدہ سے کہا کہ جمیلہ کو کہو میرے لیے پانی لائے۔

''وہ تو صبح سے نجانے کس کے ساتھ نکلی ہوئی ہے۔ منہ کالا کر کے ہی واپس لوٹے گی۔'' رشیدہ نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کس کے ساتھ گئی ہے؟'' جلال اپنی جگہ سے اٹھ کر تڑپ کر بولا۔

''صبح سالا آیا تھا تیرا وہی لے گیا تھا۔'' رشیدہ نے ایک اور تیر چھوڑا۔

جلال اور اس کے سالے کی لڑائی اس کی بہن کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ اور اب تو دونوں ایک دوسرے کا منہ تک نہ دیکھتے تھے۔ ایسی صورت حال سے رشیدہ بھرپور استفادہ حاصل کر رہی تھی۔

''جاؤ اور فوراً اسے بلا کر لاؤ۔'' جلال نے اپنی بیٹی کو کہا تو وہ بھاگتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔

''جمیلہ ابا بلا رہا ہے جلدی چل۔'' جمیلہ کی سوتیلی بہن نے اسے جا کر بتایا تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

بنا کچھ سوچے سمجھے وہ اپنی بہن کے ساتھ ہو لی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے خوف عیاں تھا۔ جلال نہایت ہی غصے کے عالم میں گھر کے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ جمیلہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی جلال گرج کر بولا:

''تیری جرأت کیسے ہوئی اس شخص کے گھر جانے کی؟''

''ابا وہ ماموں......''

جلال نے جمیلہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا۔وہ اڑ کر زمین پر جا گری اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آج اس کے باپ نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

''بھاڑ میں گیا تیرا ماموں۔''

''یا خدا آج تو مجھے موت ہی دے دے۔''جمیلہ نے اپنی کیفیت پر قابو نہ پا سکنے کی وجہ سے کہا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری شروع ہو گئی۔جمیلہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر اندر سے چٹخنی لگا کر بیڈ پر لیٹ کر رونے لگی۔وہ مسلسل ماں کو یاد کر کے رو رہی تھی۔تبھی اس کی سماعت سے رشیدہ کے کاٹ کھا جانے والے الفاظ ٹکرائے۔

''میں تو کہتی ہوں جلد سے جلد اس حرامزادی کی شادی کر دو وگرنہ کل کو ہماری عزت کا جنازہ نکال کر سانس لے گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔''تبھی اس کی سماعت سے باپ کے الفاظ ٹکرائے تو اس کی حیرت اور بے یقینی میں اضافہ ہوا۔

''تم کل ہی کوئی رشتہ دیکھو۔جیسا بھی ہو بس دو چار کپڑوں میں اس آفت کو یہاں سے لے جائے۔''

''ارے رشتہ کیا دیکھنا ہے۔''رشیدہ گویا ہوئی۔

''میرا چھوٹا بھائی اولاد سے محروم ہے۔اسی کے ساتھ بیاہ دیتے ہیں۔رشتے داروں میں بھلا اسے لے گا ہی کون؟''

''لیکن......''جلال نے کچھ کہنا چاہا لیکن رشیدہ نے چپ کرا دیا۔

''لیکن ویکن کیا......؟'' رشیدہ بولی۔

''کمی ہی کیا ہے میرے بھائی میں۔''

جمیلہ کے اوسان خطاہو گئے تھے۔اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑلیا گیا ہو۔اس کا دماغ شل ہو رہا تھا۔ایک بوڑھے سے شادی کرنے کی بجائے اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی زندگی کا چراغ ہی گل کر دے۔لیکن یہ خواہش،خواہش بن کررہ گئی اور نجانے کیوں اس نے خودکوحالات کے رحم وکرم پرچھوڑ دیا۔نجانے کب روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی اور صبح سویرے دروازہ پیٹا گیاتو اس کی آنکھ کھل گئی۔

پھرنوکروں کی طرح اس نے پہلے سب کے لیے ناشتہ تیار کیااور پھر گھر کے دیگر کاموں میں مصروف ہوگئی۔دن گزرتے چلے گئےاور کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی بوڑھے شخص سے کردی گئی۔

اس کا شوہر بھی بہن کی طرح ظالم و جابر ثابت ہوا تھا۔اس نے گھر میں کچھ جانور پال رکھے تھے۔ان کے لیے چارہ کاٹ کرلانے سے انہیں کھلانے تک کی ذمہ داری اور گھر کی دیگر ذمہ داریاں اس کے سر پر پڑ گئی تھیں۔اس کی سوتن بھی اسی گھر میں رہتی تھی۔وہاں ایک رشیدہ اس پر ظلم کرنے والی تھی تو یہاں اس کا بھائی اور بھابھی۔اگر ایک سیکنڈ کے لیے بھی وہ تھک کربیٹھتی یا کام روکتی تو دونوں مار مار کراس کا کچومر نکال کرر کھ دیتے۔

بالآخرایک بار پھر جمیلہ نے اپنی زندگی کوختم کرنے کامنصوبہ بنالیا۔ایک روز اس کا خاوند کھیتوں میں سپرے کرنے کے لیےکوئی دوائی لایا اور گھر میں رکھ کرباہر نکل گیا۔قسمت کی ماری جمیلہ نے بنا کچھ سوچے سمجھے اس دوا کو بنا سانس لیے حلق میں انڈیلا اورتڑپ تڑپ کرخودکوموت کے سپرد کردیا۔اس کے زندہ رہنے یا مرنے کا کسی کوملال کہاں ہونا تھا۔بس منہ دکھائی کے لیے اسے منوں مٹی تلے دبانے کے بعدسب نے اسے

بھلا دیا۔

شاید قسمت کی ماری ایک معصوم پری پیکر کا انجام ایسا ہی تھا۔ساری زندگی دکھوں کی آغوش میں گزار دینے والی لڑکی کو موت بھی سکون کی میسر نہ آسکی۔آخر اس کی اس موت کا ذمہ دار کون ہے؟اس کا شوہر......اس کی سوتیلی ماں......اس کے رشتے دار......یا پھر اس کا باپ؟

☆......☆......☆

مور شاہد حسین،فیروز ٹیکسٹائل ملز زدلیدا انڈر چورنگی حب چوکی لسبیلہ بلوچستان0346-3175143

ویرانے میں بہار

محمد عزیز مئے ......لڈن وہاڑی

0305-3958979



دوست محمد میرا بچپن کا دوست تھا اور پھر وہ یہاں سے کوچ کر کے سندھ کے علاقے پنوں عاقل میں جا بسے تھے۔ ایک روز مجھے اس کا اک خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا ''ڈیئر اسلم! یہاں تمہارے علاقے کا ایک لڑکا اغوا ہو کے آیا ہے اور وہ بیچارہ دن رات بے کار میں پستا ہے، جس شخص کا وہ ملازم ہے اُس کا نام غلام حیدر ہے اور وہ میرا ہمسایہ ہے، جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں ایک دس سال کا لڑکا بطور نوکر رہتا ہے تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ معصوم بچہ کس کا ہو سکتا ہے اور کس مجبوری کے تحت دن رات کولہو کے بیل کی طرح کام کاج میں جتا رہتا ہے۔ ایک دن میں نے موقع پا کر اس سے پوچھنا چاہا تو وہ کترا گیا۔ دراصل وہ مجھے بھی غلام حیدر کا ساتھی سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مجھ سے بھی خوفزدہ رہتا تھا

تفصیل تم یہاں آ کر سن اور دیکھ سکتے ہو اور اگر میرے ذریعے سے وہ بچہ اپنے ماں باپ تک پہنچ جائے تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔

تمہارا مخلص دوست محمد

اس خط کے ملنے سے کم وبیش ایک ماہ قبل ایک شام مجھے میرے منجھلے بیٹے نے بتایا تھا کہ ابا مولوی واہ سے ایک لڑکا جو کہ نو دس سال کا ہے پچھلے دنوں اغواء ہو گیا ہے۔

میں نے پوچھا: ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ ''میرا ایک کلاس فیلو مولوی واہ سے یہاں پڑھنے آتا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ ہمارے علاقے سے ایک لڑکا اغوا ہو گیا ہے۔ اس کی ماں بے چاری رو رو کر اندھی ہو چکی ہے۔ اور باقی تمام گھر والوں کا بھی برا حال ہے۔''

''ہاں بیٹے۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''یہ بات درست ہے۔ انسان مرنے والوں کا غم برداشت کر سکتا ہے لیکن اگر کوئی فرد آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو جائے اور اس کا اتہ پتہ بھی نہ ہو لگے تو اس کی یاد ہمہ وقت تڑپاتی رہتی ہے۔ اور پھر جس بدنصیب کا بچہ اغوا ہو جائے۔ اس کا ایسا حال تو ہونا ہے۔''

دوست محمد کا خط ملنے کے بعد اس دن جب میرا بیٹا سکول سے آیا تو میں نے اسے بلا کر کہا کہ بیٹا کچھ دن قبل تم نے بتایا تھا کہ مولوی واہ سے ایک لڑکا اغوا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

''تفصیل تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔'' میرے بیٹے نے جواب دیا۔

''چلو خیر صبح اپنے دوست سے پوچھ کر آنا۔'' میں نے کہا

دوسرے دن بھی لڑکے کے بارے میں تفصیل معلوم نہ ہو سکی کیونکہ وہ لڑکا بھی تفصیل نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ اس بات کی تفصیل معلوم کرتے کرتے تین چار دن مزید بیت گئے۔ اور ایک دن میں خود ہی مولوی واہ جا پہنچا تا کہ

اس لڑکے کے ماں باپ سے مل کر تفصیل معلوم کر سکوں۔

مولوی واہ پہنچنے کے بعد میں بڑی آسانی سے اس شخص کے گھر پہنچ گیا جس بیٹا اغوا ہوا تھا۔اس کا نام فیض بخش تھا اور وہ وہ ذات کے سرگانے تھے۔اس کے اغوا شدہ بیٹے کا نام نادر بخش تھا۔نادر کے علاوہ اس کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔دو بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھی۔بیٹے کے اغوا کے بارے میں اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا:

''ہمارے علاقے میں ایک شخص نے جو کہ عارفوالا کا رہنے والا تھا۔ایک مربع زمین ٹھیکے پر لی ہے۔اور اس نے خربوزے کاشت کرر کھے ہیں۔ہمارے علاقے کی عورتیں دہاڑی پر خربوزے چنتی جاتی تھیں اور اکثر وبیشتر ساتھ ان کے معصو بچے بھی چلے جاتے تھے۔میری بیوی اور بیٹیاں بھی دیہاڑی کرنے جاتی تھیں اور کبھی کبھی جب اسکول سے چھٹی ہوتی تو نادر بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔

آخری دن جب وہ اغوا ہوا اس دن بھی سکول سے ہفتہ واری تعطیل تھی۔نادر اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ چلا گیا تھا۔اس دن خربوزوں کے پانچ ٹرک لوڈ ہو کر مختلف شہروں کی جانب روانہ ہونے تھے۔ان ہی ٹرکوں میں سے ایک ٹرک کا ڈرائیور نادر کو اپنے ساتھ لے گیا۔اس دن کے بعد ہم نے اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔اس بات کو آج کم وبیش پانچ ماہ بیت چکے ہیں۔ہم نے ان ٹرکوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن ناکام رہے۔

تھانے میں رپورٹ لکھوانا چاہی تو تھانے والوں نے کہا:

''آج کل لڑکے اکثر ناراض ہو کر گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔اور کچھ روز بعد خود ہی لوٹ آتے ہیں۔تمہارا بیٹا بھی لوٹ آئے گا۔تعویذ دھاگہ بھی کروایا۔ایک صاحب نے تو حساب لگا کر اتنا بھی کہا کہ تمہارا بیٹا شمال کی جانب ہے۔دوسرے نے مغرب کا بتایا تیسرے نے بھی شمال کا۔ہم تو بہت پریشان ہیں۔نہ جانے کس ظالم اور سنگدل نے ہمارے لعل کو اغوا کیا ہے۔''

بات مکمل کر کے فیض بخش دھواں دھار رونے لگا اس کی بیوی اور بچیاں بھی رونے لگ گئی تھیں۔ ان کی حالت زار دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم آلود ہو گئیں۔

''دیکھو بھائی آج سے پہلے نہ میں آپ کو جانتا تھا اور نہ آپ مجھے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں جس مقصد کے لیے آیا ہے وہ یہ ہے کہ میرا ایک دوست سندھ میں رہتا ہے۔ کچھ روز قبل مجھے اس کا خط ملا تھا جس میں اس نے مختصراً لکھا تھا کہ ہمارے علاقے کا ایک دس گیارہ سالہ بچہ اغوا ہو کر اس علاقے میں ایک شخص کی نوکری کرتا ہے۔ مجھے میرے بیٹے نے آپ لوگوں کا بتایا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ آپ ہی کا بچہ ہو۔

فیض بخش اور اس کے اہل وعیال کے چہروں پر امید اور آس کے احساسات صاف نظر آنے لگے۔ فیض بخش نے جلدی سے پوچھا۔

''تمہارا دوست کہاں رہتا ہے۔ اس نے خط میں اس بچے کا نام کیا لکھا ہے؟''

''میرے دوست نے بس یہی بتایا تھا جو میں نے آپ لوگوں کو بتا دیا۔'' میں نے بتایا۔ ''اگر آپ لوگ چاہو تو ہم وہاں جا کر ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' فیض بخش تڑپ کر بولا۔ ''آپ مجھے لے جاؤ سارے اخراجات کا ذمہ میرا ہو گا۔''

''کیوں شرمندہ کر رہے ہیں آپ مجھے۔'' میں نے اسے گلے لگا کر کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آ جاؤ وہیں سے کل صبح نکل جائیں گے۔''

''نہیں آپ یہیں رہو۔'' فیض بخش بولا۔

''میں نے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں واپس نہ جاؤں تو انہیں پریشانی لاحق ہو گی۔''

''آپ بیٹھیں میں سارا بندوبست کرتا ہوں۔'' فیض بخش نے کہا اور اپنے داماد کو بلا کر کہا۔ ''تم اسلم بھائی کے گھر چلے جاؤ اور انہیں بتا آؤ کہ اسلم بھائی ہمارے مہمان ہیں اور یہ بھی کہ ہم لوگ صبح اسلم بھائی کے ساتھ سندھ ان

کے دوست سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس لیے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔'' اس کا داماد اسی وقت چلا گیا۔

وہ سبھی لوگ میرے سامنے یوں بچھے جا رہے تھے جیسے میں کوئی بہت ہی اہم ہستی ہوں۔ لیکن ان کے لیے کہیں واقعی اسی وجہ سے زیادہ اہم اور قبل قدر ہو گیا تھا کیونکہ میری باتوں سے انہیں اپنا لخت جگر ملنے کی امید پیدا ہو چکی تھی۔

حسب پروگرام دوسرے دن ہم علی الصبح گاؤں سے نکل گئے۔ جب ہم دوست محمد کے گھر پہنچے اس وقت سورج غروب ہونے میں تقریباً دو گھنٹے باقی تھے۔ دوست محمد نے ہمارا پر جوش اور والہانہ استقبال کیا۔ تعارف کے وقت جب میں نے بتایا کہ یہ فیض بخش ہے اور ہمارے قریبی گاؤں میں رہتا ہے۔ اس کا دس گیارہ سالہ بیٹا نادر بخش اغوا ہو چکا ہے۔ تمہارا خط پا کر میں نے ان سے رابطہ کیا اور آج ہم دونوں تمہارے پاس ہیں۔''

اس وقت فیض بخش بڑا جذباتی ہو رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ اس لڑکے کو دیکھ لے جو کہ شاید نادر بخش تھا لیکن اس وقت مجبوری یہ آن پڑی تھی کہ ان دنوں دوست محمد کے گوٹھ کے قریب ایک میلہ ہو رہا تھا۔ فیض بخش نے یہ سنا تو وہ دوست محمد سے کہنے لگا۔

''بھائی دوست محمد! تم یقیناً میری حالت کا اندازہ لگا سکتے ہو، کیوں نہ ہم بھی اسی میلے پر چلے جائیں تا کہ نادر کو جلد از جلد دیکھ سکوں۔''

دوست محمد نے فیض بخش کی کمر تھپتھپائی اور بولا:

''حوصلہ رکھو میرے یار! میں نے ایک لڑکا بھیج دیا ہے جو کہ سبھی لڑکوں کو لے کر آنے ہی والا ہے۔ تم لوگ چائے پانی پیو، اتنی دیر میں سبھی لڑکے بھی پہنچ جائیں گے۔''

لیکن ہوا یوں کہ دوست محمد کا کہنا غلط ثابت ہوا۔ کچھ لڑکے آ گئے اور کچھ میلے پر ہی رہ گئے جن میں پتہ چل گیا کہ ایک نادر بھی ہے۔ آنے والے لڑکوں نے دوست محمد کو بتایا

''چاچا! وہ لڑکا آپ کا پیغام سن کر کہیں چھپ گیا ہے اور اب کے بیٹے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔''

یہ بات سن کر فیض بخش تڑپ اٹھا لیکن دوست محمد نے اسے پاس بٹھالیا اور کہنے لگا۔

''گھبراؤ مت! وہ بیچارہ کہاں جاسکتا ہے؟''

اس وقت چار لڑکے اس انداز میں بیٹھک میں داخل ہوئے کہ لڑکوں نے تیسرے کو دونوں طرف سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا س۔ اور چوتھا لڑکا مستعد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ نادر ہی تھا۔ ان میں سے ایک بولا:

''ابا! ہم نے اسے آپکا پیغام دیا تو یہ نجانے کہاں گم ہوگیا۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے تلاش کیا ہے۔''

اپنے بیٹے کو دیکھ کر فیض بخش خود پر قابو نہ پا سکا اور بے اختیار اٹھ کر اس سے چمٹ گیا۔ لیکن نادر پر یقیناً ابھی اپنے اغوا ہونے کا اچھا خاصا اثر تھا۔ اس لیے وہ حیران و پریشان سا تھا۔ اپنے باپ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر امید اور رونق پیدا ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے جب اسے یقین آیا کہ اب وہ محفوظ ہے اور اپنے گھر جا سکے گا تب وہ اپنے باپ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ رات ہم نے دوست محمد کے ہاں گزاری۔ ہم چاروں یعنی دوست محمد، فیض بخش، میں اور نادر ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ دوست محمد نے اس وقت تفصیل بتائی اور کہا کہ:

''جب میں نے اپنے ہمسائے غلام حیدر کے گھر میں نادر کو دیکھا تو میں نے حیدر سے پوچھا کہ یہ لڑکا کون ہے؟

جواباً حیدر بولا کہ یہ میرا نوکر ہے۔

میں نے پوچھا: ''کہاں کا رہنے والا ہے؟''

اس نے بتایا: ''دراصل یہ اغوا شدہ لڑکا ہے اور میں نے اسے ملتان سے خریدا ہے۔''

غلام حیدر نادر سے سارے کام کرواتا تھا اور مار پیٹ بھی بہت کرتا تھا۔ میں نے کئی بار غلام حیدر کو منع بھی کیا اور سمجھایا بھی کہ یہ بیچارہ نہ جانے کس بدنصیب کا بیٹا ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ تم ایسا کرو اخبار میں

اشتہار دے دو یہ یقیناً اپنے والدین تک پہنچ جائے گا اور تمہیں دعائیں دے گا لیکن وہ الٹا غصے ہو جاتا اور کہتا کہ میں نے اسے خریدا ہے۔ یہ میرا نوکر ہے۔

''کتنے کا خریدا ہے تم نے؟'' میں نے ایک دن پوچھا۔

''وہ لوگ دس ہزار مانگتے تھے۔'' غلام حیدر نے بتایا۔ ''میں نے سات ہزار میں خریدا ہے۔''

''تم سات ہزار میں یہ مجھے دے دو۔'' میں نے غلام حیدر سے کہا اور سات ہزار میں میں نے اسے خرید کر اپنے پاس رکھ لیا۔ پہلے تو نادر مجھ سے بہت خوفزدہ رہتا تھا لیکن جلد ہی ہمارے سلوک کے باعث ہم سے مانوس ہو گیا۔ میں نے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے بوریوالا بتایا۔ چنانچہ میں نے اسلم سے رابطہ کیا اور اسے مختصراً خط میں اس کے بارے میں بتایا چنانچہ اسی کے نتیجے میں اب تم لوگ میرے پاس ہو۔

ساری بات سن کر فیض بخش نے جیب سے رقم نکالی اور آٹھ ہزار روپے گن کر دوست محمد کو دینا چاہے تو وہ الٹا ناراض ہو گیا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو کیا مجھے بھی غلام حیدر سمجھ رہے ہو۔ یہ میرا بھی بیٹا ہے۔؟''

دوسرے دن ہم دوست محمد کے ہاں سے روانہ ہوئے تو انہوں نے شدید اصرار کر کے نادر بخش کو دو جوڑے کپڑوں کے، صافہ، جوتا اور مٹھائی کا ایک ڈبہ لے کر بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ فیض بخش، دوست محمد کا اور میرا بہت مشکور تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ فیض بخش اور دوست محمد کے گھرانوں کے تعلقات میں اتنا اضافہ ہوا کہ نہ صرف وہ گہرے دوست بن گئے بلکہ رشتے دار بھی بن گئے۔ جی ہاں نادر بخش کی شادی دوست محمد کی بیٹی سے ہو گئی اور دوست محمد کا بڑا بیٹا فیض بخش کا داماد بن گیا اور ان کے گھر خوشیوں کے گہوارے بن گئے۔



وہ ایک سہانی صبح تھی۔ بادلوں کی گھن گرج، کڑکتی آسمانی بجلی نے خوف سا پیدا کر رکھا تھا۔ صبح ہوتے ہی ہر طرف اندھیرے کی چادر تن گئی تھی۔ ہوائیں زرد پتوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑاتی پھرتی تھیں۔ رِم جھم پھوار نے برساتی بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی، چڑیاں، کوّے، لالیاں بارشی پانی میں نہا رہی تھیں۔ بارشی پانی میں اپنے پَروں کو پھڑ پھڑا کر پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھیں۔ پھر بارش رُک گئی تھی اور پانی کے قطرے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی میں سنہرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ درختوں کی چھوٹی بڑی شاخیں مست ہواؤں میں جھوم رہی تھیں۔ ہر طرف مستی کی فضا چھائی تھی لیکن دِنیو بابا گاؤں سے شہر جاتی پکی سڑک کے کنارے آلتی پالتی مارے دور جاتی سڑک کو تک رہا تھا۔

یہی سڑک تھی جس نے اُسے کرب کی تپتی ریت پہ بیٹھا دیا اور اُسے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

دِینو کا گاؤں کثیر آبادی پر مشتمل تھا۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب دین محمد عرف دِینو جوان تھا۔ قد کاٹھ لمبا، سینہ چوڑا، خوبصورت نین نقش، بھر بھرا جسم، سادہ لباس، طبیعت میں دیہاتی پن، سر پہ روایتی پگڑی اُس کی شخصیت کو نکھارتی تھی۔ ملنسار اور مہمان نواز تھا۔ حسن و جمال اُس کے انگ انگ سے ٹپکتا تھا۔ جب بولتا تو لفظوں میں مٹھاس ہوتی۔ کسی نے اُسے لڑتے نہیں دیکھا تھا، ہر ایک سے محبت سے ملتا تھا۔ غصہ تو اُس سے دور بھاگتا تھا۔

دینو کا والد اُس کے بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ ماں اُس وقت چھوڑ گئی تھی جب دِینو جوانی کی پہلی سیڑھی چڑھ رہا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد عزیز و اقارب ایسے غائب ہوئے جیسے خزاں سے پہلے بہار جاتی ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ باپ نے وارثت میں پانچ ایکڑ زمین چھوڑی تھی۔

دِینو بابا پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ گاؤں میں سکول کی سہولت نہیں تھی۔ پورا گاؤں پسماندہ۔ سکول نہ ہسپتال، صفائی کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔ گھروں کے گندے پانی کے اخراج کے لئے کچی نالیاں بنی ہوئی تھیں جو آئے روز بند ہو جاتیں اور بدبودار گندا پانی پورے گاؤں میں پھیل جاتا۔ مچھروں کی تو جیسے عید ہو۔ اُن کے معشوقے چل پڑتے اور خلقت انسانیت ڈینگی، ملیریا جیسی موذی مرض میں مبتلا ہو جاتی۔ بچے تو جلد اِن بیماریوں کی لپیٹ میں آ جاتے اور آئے روز اِس گاؤں کی آبادی بڑھنے کی بجائے کم ہوتی جاتی۔ ہر چہرے سے اُداسی، مایوسی واضح دِکھتی تھی۔۔۔تن پہ صاف ستھرا کپڑا تک میسر نہ تھا اور خوراک تو۔۔۔۔کیا کہنے۔۔۔۔

گاؤں کا شہر سے رابطہ بالکل نہیں تھا۔۔۔غربت میں پِسا یہ گاؤں اپنی مدد آپ کے تحت زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے میں مصروف عمل تھا۔ گاؤں والوں کی فصلیں کھیتوں میں پڑی پڑی گل سڑ جاتی۔ منڈیوں تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے رزمبادلہ مل نہ سکتا تھا۔ جو اناج استعمال ہوتا کرتے باقی کھیتوں میں خراب ہوتا رہتا۔ یوں گاؤں غربت، افلاس اور سیاسی لیڈروں کی ہٹ دھرمی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا تھا۔

برسات کا موسم گاؤں کے لئے کسی عذاب سے کم نہ ہوتا۔ کہیں چھت گری ہے تو کہیں کسی کا صحن دریا کی شکل

اختیار کر گیا ہے۔۔کہیں دیوار گری ہے تو کہیں کسی غریب کی کچی بیٹھک بیٹھ جاتی۔

دِینو ہر کسی کے کام آتا۔۔جذبہ انسانیت اُس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔یہ بھی برسات کا موسم تھا۔بارش تھم گئی تھی،عورتیں بالٹیاں،پراتیں لے کر اپنے اپنے گھر کے صحن سے بارشی پانی نکال رہی تھیں کہ ایک دَم شور اُٹھا۔شرفو۔۔۔۔شرفو کا مکان گر گیا ہے۔۔چیخ و پکار۔۔۔بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔۔۔کی آوازیں زور پکڑ گئیں۔

دِینو اپنے گھر سے دھوتی باندھے،بدن کو بنیان سے ڈھانپے ہوئے باہر کی طرف بھاگا اور شرفو کے گھر بارشی پانی میں چھما چھم کرتے پہنچ گیا۔وہاں گاؤں والوں کا ہجوم جمع تھا۔کوئی کَسّی سے اینٹیں ہٹا رہا ہے تو کوئی کچھ۔۔ملبے تلے تھڑ کتے جسم سسک رہے تھے۔۔۔ریسکیو کی سہولت نہ فضائی امداد۔ایسے لگتا اِس گاؤں کا ہر طرف سے رابطہ منقطع ہے۔۔۔گاؤں کے چاروں طرف پانی ہی پانی۔۔دِینو نے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر شرفو کی فیملی کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔۔شرفو،اُس کی بیوی اور اُس کا کم سن بیٹا مکان گرتے ہی ہلاک ہو گئے اور صرف جوان سالہ شرفو کی بیٹی بختو بمشکل ملبے تلے سے زندہ سلامت بچ نکلی۔۔۔

بارش رُک گئی گویا طوفان تھم گیا مگر بختو کے گھر یہ بارش زحمت بن کر برسی تھی۔ایک قیامت تھی جو اُس کے گھر ٹوٹی تھی۔روتے دھوتے وقت سرک گیا اور گاؤں والوں کی رضامندی سے بختو کو دِینو کے نکاح میں دے دیا گیا۔

یوں دِینو اور بختو۔۔میاں بیوی کے بندھن میں بندھ کر ایک چھت کے نیچے زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے لگے۔خزاں کے بعد بہار رُت آئی تھی۔فصلوں،درختوں،پرندوں،چرندوں نے خوب جشن بہاراں منایا تو اِنسان بھی خوشی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اِنسان کتنا کم ظرف وارد ہوا ہے۔۔لمحوں بھر کی خوشی میں برسوں کے درد و غم بھول جاتا ہے اور اس طرح دولت کے نشے میں رشتے داروں،ساتھیوں کو بھول جاتا ہے۔جس طرح دِینو کے رشتے دار منہ موڑ گئے تھے۔لیکن حیران کن بات تو یہ ہے کہ اِنسان کتنی ہی نافرمانیاں کرے،کتنی ہی گُستاخیاں کرے،کتنے گناہ کرے وہ ذات جو

نیلے آسمان پہ کھڑی ہے منہ نہیں موڑتی بلکہ اِس انتظار میں رہتی ہے کہ کب میرا بندہ میری طرف لوٹتا ہے۔ اِنسان گناہ پہ گناہ کیے جاتا ہے اور وہ رحمان رحمتوں ،نعمتوں سے نوازتا جاتا ہے۔ ہر عیب پہ پردہ ڈال کر عزت واحترام کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ اپنے بندے کو ذلیل وخوار نہیں کرتا۔ قدرت رکھتے ہوئے بھی رحم کرتا جاتا ہے اور اِنسان کتنا بے شرم ہے اُس پیدا کرنے والی ذات "اللہ" کو مانتا ہے لیکن اللہ کی ایک بھی نہیں مانتا۔ اُس کا ڈر و خوف نہیں ہے۔ ڈھٹائی سے گناہ در گناہ کرتا جاتا ہے اور اِس افراتفری میں موت کا پروانہ آجاتا ہے اور یہ اِنسان اپنی عاقبت خراب کر جاتا ہے لیکن جسے رب رحیم توبہ کی توفیق دیتا ہے۔۔۔ توبہ کرتا ہے اور دین و دُنیا اور آخرت سنوار لیتا ہے۔۔ جو بندہ رب کا ہو جاتا ہے رب بھی اُس کا ہو جاتا ہے۔۔۔

دِینو اور بختو مثالی میاں بیوی ثابت ہوئے۔ دِینو کی طرح بختو بھی اَن پڑھ تھی لیکن حسن و جمال کی ملکہ تھی۔ میک اپ نام کی کوئی چیز نہیں تھی پھر بھی وہ چٹی گوری تھی۔ قدرتی حُسن میں پری نما لگتی تھی۔

زندگی کے مہ و سال گزرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے آنگن میں پھول کھلا دیئے۔ سلیمان اور کامران کی صورت میں دو پھول اُن کے آنگن میں آ گئے تھے۔ دونوں بہت پیارے اور ہر دل عزیز تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے آنگن میں رونقیں لوٹ آئیں اور دِینو جب بھی کھیتوں سے گھر لوٹتا ،دونوں بچوں کو بانہوں میں بھر لیتا ۔دن بھر کی تمام تھکاوٹ دور ہو جاتی ۔۔۔ بچوں کی قلقاریاں اُس کی روح تک سرشار کر دیتی اور دِینو بچوں کے ساتھ خود بھی بچہ بن جاتا ،اُن کے ساتھ کھیلتا۔ کچے صحن میں اُن کی سواری بن جاتا اور سلیمان اور کامران اُس کی پیٹھ پہ سوار ہو کر صحن بھر کی سیر کرتے۔ دِینو کے لئے دونوں بچے جان تھے تو بختو اُن پہ جان چھڑکتی تھی۔

دن گزرتے رہے اور سلیمان اور کامران بچپن سے لڑکپن سے ہوتے جوانی کی دہلیز پہ قدم جمانے لگے۔ دِینو اور بختو کے بالوں میں چاندی اُترنے لگی تھیں اور ہڈیاں کمزور ہونے لگی۔ بڑھاپا سر چڑھ کر بولنے لگا۔۔۔

کئی بہاریں آئی اور لوٹ گئیں۔ ساون رُت آتی تو دِل کے تار بج اُٹھتے۔ یہ بھی اِنہی برساتی دِنوں کی بات ہے

۔الیکشن سر پہ آئے تو سیاسی لیڈروں نے اس پسماندہ گاؤں کی طرف رُخ کیا۔۔کھوکھلے وعدے ہوئے ،جھوٹ پہ جھوٹ بولے گئے۔۔۔اپنے مفاد کے لئے ہر حد سے گزرنے کے اعلان ہوئے۔دیہاتیوں کے دِلوں سے کھیلا گیا۔۔۔لیکن ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر نے صداقت دکھائی۔گاؤں میں پکی نالیاں،گیس بجلی اور گاؤں سے شہر تک پکی سڑک کی اُمید دلائی اور پھر الیکشن کے بعد یہ وعدہ وفا ہوا۔گاؤں کو شہر کے ساتھ ملایا گیا۔۔ پکی سڑک بن گئی۔گاؤں میں بجلی،گیس آ گئی، پکی نالیاں بن گئیں۔گاؤں کی قسمت بدل گئی۔تبدیلی آ گئی ۔۔۔گاؤں والوں کی منڈیوں تک رسائی ہوگئی تو لوگوں کے دِل تنگ ہونے لگے۔۔۔زبان پہ شکوے،دِلوں میں نفرتیں عنود کر آئیں۔نگاہوں میں بے شرمی اور گفتار میں بدتمیزی آ گئی۔اِس ماحول کا اثر گاؤں کے ساتھ ساتھ دِینو کے گھر پلتے سلیمان اور کامران پر بھی ہونے لگا۔۔۔

گاؤں ترقی کی طرف گامزن ہوگیا۔اونچے اونچے محل تعمیر ہونے لگے۔گیٹ بڑے بڑے بننے لگے تو دِل کے دروازے چھوٹے ہو گئے۔۔محبتیں ناپید ہوتی گئیں۔گاؤں میں جرائم شروع ہو گئے۔۔۔گاؤں میں اسکول ،ہسپتال بن گئے۔ہر سہولت میسّر ہونے لگی۔

دِینو نے سلیمان اور کامران کو اسکول داخل کروایا۔وہ گاؤں کے ماحول سے نکل کر شہر میں کالج یونیورسٹی تک پہنچ گئے۔اب وہ جوان ہو گئے تھے اور دِینو اور بختو بڑھاپے میں جا پہنچے تھے اور پھر ایک شام قدرت خداوندی کی طرف سے بختو کا بلاوا آ گیا اور دِینو۔۔۔پھر سے تنہا ہو گیا۔۔

سیانے سچ ہی کہتے ہیں کہ جب بڑھاپا آتا ہے تو بیوی ہی شوہر کا سہارا ہوتی ہے،دُکھ سکھ کی ساتھی،دِینو،،بختو کو یاد کر کے پہروں روتا۔۔۔گھر کا صحن ویران اور در و دیوار وحشت زدہ ہو گئے۔۔۔وہ گھر جہاں خوشیاں تھیں ،مسکراہٹیں تھیں کاٹنے کو آتا۔خوشیاں لوٹ گئی تھیں،اب صرف اُداسی ،مایوسی کے سائے منڈلاتے تھے ۔۔۔۔وحشت زدہ گھر تھا اور دِینو۔۔۔۔۔دونوں بیٹے ماں کے مرنے پہ آئے تھے اور ماں کے لاشے کو کندھے

تو آ کر دیئے اور پھر ایسے شہر کی طرف گئے کہ پھر گاؤں کا رُخ تک نہ کیا۔۔۔

دینو ان کے سروں پہ سہرے سجانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور سلیمان اور کامران کچھ اور سوچ رہے تھے۔ دونوں نے یونیورسٹی میں اپنی کلاس فیلو کے ساتھ معشوقے کیے۔ عشق کی پتنگیں اڑی کہ دونوں بھائیوں نے کورٹ میرج کرکے اپنے اپنے گھر شہر میں بسا لئے اور باپ کو بھول گئے۔ اُس باپ کو جس نے گھر کے کچے صحن میں انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھایا تھا۔۔۔

بختو کو فوت ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور یہ دو سال کس کرّب، درد، مشکلات میں گزرے، یہ تو کوئی دِینو بابا سے پوچھے۔۔۔ دِینو اب دِینو بابا ہو گیا تھا۔۔۔

دِینو اُن پڑھ اور سادہ دِل تھا۔ زمانے کی ہوا نے اُسے نہیں بدلا تھا۔۔۔ موبائل آ بھی گئے لیکن دِینو کو موبائل کا استعمال نہ آیا۔۔۔ اور پھر دونوں بیٹوں کا کوئی اتا پتا نہ لگ سکا۔۔۔

دِینو صبح سے شام تک گاؤں کی اُس پکی سڑک پہ بیٹھتا ہے جس سڑک نے گاؤں کو شہر سے ملایا ہے۔ اس سڑک پہ الٹی پلٹی مارے بیٹوں کی راہ تکتا ہے لیکن بیٹے اپنی خرمستیوں میں گم ہیں۔۔۔ دِینو پکی سڑک کو ہاتھوں سے کھرچتا رہتا ہے اور سوچوں کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ دِینو سوچتا ہے۔۔۔ کاش۔۔۔ یہ سڑک نہ بنتی تو میرے بیٹے میرے پاس ہوتے۔۔۔ یہ سڑک ہی میری دُشمن ہے جس نے میرے لختِ جگر چھین لئے ہیں۔۔۔ جس دن گاؤں سے شہر تک سڑک بن رہی تھی گاؤں والوں کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر چہرہ کھلکھلا اُٹھا تھا لیکن آج۔۔۔۔ دِینو اُس وقت کو یاد کر کے روتا ہے جب سیاسی لیڈر کو گاؤں سے شہر تک پکی سڑک بنانے کا کہا تھا۔۔۔ کاش یہ دن کبھی نہ آتا تو میرے بیٹے مجھ سے جُدا نہ ہوتے۔۔۔ گاؤں نے ترقی تو کر لی۔۔۔ لیکن رویّوں میں بھی تبدیلی آ گئی۔ نئی نسل نے دِینو کی قربانیاں بُھلا دی۔

اِنسان نے ترقی تو کر لی لیکن رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا۔ دولت کی ہوس میں ڈوب کر انسانیت کو بُھول گیا

۔نوٹوں کی چمک نے ماں باپ، بہن، بھائی، دوست واحباب تک بُھلا دیئے۔۔۔جس کے پاس دولت وہی یار اپنا۔۔۔سلیمان اور کامران کا بھی یہی حال ہوگا اور بیچارہ دِینو آج بھی پکی سڑک پہ بیٹھا اپنے بیٹوں کی راہ تک رہا ہے۔۔۔دِینو کو گاؤں والے کھانا دے دیتے ہیں۔وہ کھانا کھاتے نہیں بلکہ روٹی کے ٹکڑوں کو دیکھ کر چھم چھم روتا ہے۔۔۔دِینو روز جیتا ہے روز مرتا ہے۔۔۔بس ان حسرتوں میں زندہ ہے کہ بیٹے واپس آ کر اُس کے لاشے کو کندھا تو دے سکیں۔۔۔دو مٹھی مٹی اُس کی قبر پہ ڈال سکیں۔

مجید احمد جائی۔ملتان شریف 0301-747271



صنوبر کچن میں دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھی کہ اچانک گھر کے موبائل پر رنگ بجی۔ وہ ہاتھ صاف کرتی ہوئی موبائل کی طرف بڑھی۔ دیکھا تو اجنبی سا نمبر سکرین پر چمک رہا تھا۔ وہ کشمکش میں تھی کہ کون ہے؟ پھر سے رنگ پاس ہونے لگی تو اس نے دھڑکتے دل سے کال رسیو کی تو آگے سے غیر انجانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی: ''کون بات کر رہا ہے؟''

''سوری رانگ نمبر۔'' صنوبر نے جلدی سے کہا اور کال بند کر کے تیز تیز سانس لینے لگی۔

عین اسی وقت اس کی ساس کمرے سے باہر آئی اور پوچھا کہ کون ہے؟

''پتہ نہیں کوئی نیا نمبر تھا۔'' صنوبر نے بتایا۔ اتنا کہہ کر صنوبر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔

دوسری طرف کال کرنے والے [illegible] لینے

لگا۔ پھر کیا تھا اس لڑکے نے کال پہ کال کرنا شروع کر دی لیکن صنوبر بار بار اس کی کال کاٹ دیتی۔ پھر اس نے میسج کرنے شروع کر دیئے۔

''جانو پلیز اٹینڈ مائی کال۔''

''پلیز ایک بار بات تو کرو۔''

صنوبر کی ساس بڑی مکار اور لڑائی جھگڑے والی تھی۔ صنوبر کی بے عزتی اس کے شوہر سے کروانے کا کوئی بھی چانس ضائع نہ ہونے دیتی تھی۔ وہ بار بار صنوبر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے خبر دار کر رہی تھی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

اس واقعے کے دو دن بعد پھر اسی نمبر سے کال آنے لگی تو اس کی ساس نے کال اٹینڈ کی۔ آگے سے لڑکے کی آواز سنائی دی۔ ''جان مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی۔ پلیز بولو ناں۔ تمہاری آواز سننے کے لیے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔''

یہ سب کچھ سن کر اس کی ساس نے خاموشی سے کال کاٹ دی۔ جب رات کو صنوبر کا شوہر گھر آیا تو اس نے ساری بات اسے کہہ سنائی کہ تمہاری بیوی کا کسی لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا ہے۔ صنوبر کے شوہر نے بنا کچھ سمجھے سوچے اسے تشدد کا نشانہ بنایا۔ بات یہیں پر ختم نہ ہوئی بلکہ اس کے شوہر نے اس کے بھائی کو فون کر کے آنے والی کالز اور میسجز کا بتا کر کہا کہ فوراً اسے یہاں سے لے جاؤ۔

کچھ ہی دیر میں صنوبر کا بھائی اور ماں آ گئے۔ صنوبر کے شوہر اور ساس نے اس کے بدچلن اور زانی ہونے کے طعنے دیئے اور کال اور میسجز دکھائی تو اس کے بھائی نے بھی بنا کچھ سوچے سمجھے اپنی بہن کو زدوکوب کیا۔ صنوبر نے اپنے تینوں بچوں کی قسم کھائی لیکن کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ اس کی ساس تو جلتی پر تیل چھڑکنے والی بات کر رہی تھی کہ جو اپنے شوہر کو دغا دے سکتی ہے۔ اس کے لیے قسمیں کیا۔

اس کا بھائی طیش میں آ گیا اور اس نے صنوبر کا گلہ دبا دیا۔ پلک جھپکتے میں صنوبر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر

گئی۔ ایک رونگ نمبر نے ایک بے گناہ لڑکی کو نہ صرف ذلیل کردیا بلکہ اسے زندگی سے بھی محروم کردیا۔

صنوبر کے بھائی کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ موبائل کا ڈیٹا جب چیک کیا گیا تو صنوبر نے ایک دس سیکنڈ کی کال ریسیو کی تھی جو "رانگ نمبر" سے زیادہ نہ بولی اور کال کاٹ دی گئی تھی۔ فوراً ہی لڑکے کا ڈیٹا نکلوا کر اسے گرفتار کرلیا گیا۔ جب صنوبر کے بھائی کو اپنی بہن کی پاک دامنی کا علم ہوا تو اس نے بنا سوچے سمجھے اپنی زندگی کا چراغ گل کردیا۔

سوچیئے قصوروار کون ہے؟

مکار ساس......شکی و جاہل شوہر......نام نہاد غیرت مند بھائی......رانگ نمبر یا پھر ہمارا معاشرہ؟

☆......☆......☆

انعم شہزادی۔ گجرات   (فیس بک انچارج آف شاہین سیریز)



تینوں دوست نقشہ سامنے میز پر رکھے سر جوڑے مضطرب براجمان تھے۔علی اور حیدر بضد تھے کہ نقشہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جبکہ عثمان متواتر انہیں سمجھا رہا تھا کہ نقشے تک پہنچنے سے قبل ہی اجل اچک لے جائے گی لیکن دونوں دوستوں کی ضد اپنی جگہ برقرار تھی۔

''میں نے خود پتہ لگوایا ہے۔ یہ خزانہ جس غار کے اندر ہے۔اس سے پہلے ایک گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے۔'' عثمان نے انہیں بتایا۔''اس جنگل کی طرف جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا۔''

''لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔'' حیدر بولا۔'' ہم ثابت کردیں گے کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں۔اس دنیا میں سب سے طاقتور انسان ہے۔چاہے جو ہر چیز کو اپنا بندی بنا لے۔''

''وہ لوگ اور ہیں۔''عثمان بے چارگی سے بولا۔'' ہم لوگ اپنی قسمت نہیں بدل پارہے ہر چیز کو اپنا بندی کیسے بنائیں گے؟''

''قسمت بدلنے کا وقت اب آچکا ہے میرے بھائی۔''علی نے لقمہ دیا۔''اگر اس موقع سے ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ممکن ہے کوئی اور ہی مستفید ہو جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔''

عثمان نے مجبوراً حامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔اس کے من کے مندر میں خوف کی گھنٹیاں پیہم بج رہی تھیں لیکن دوستوں کے سامنے انکار کر کے وہ خود کو بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔اس لیے اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا۔

☆......☆......☆

تین گھنٹے مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک چکے تھے۔گاڑی سے اترتے ساتھ ہی انہوں نے پہلے ایک ہوٹل سے جا کر ڈٹ کر کھانا کھایا۔کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ویٹر سے چوک محل کا راستہ پوچھا تو اس نے حیرت سے انہیں گھورا۔

''وہاں کیا کرنے جا رہے ہو تم لوگ؟''ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا راستہ بتا سکتے ہو؟''حیدر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔''ویٹر بولا۔''لیکن مشورہ دوں گا یہیں سے واپس چلتے بنو۔جو بھی اس طرف گیا کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔''

''کیا راستہ بنا سکتے ہو؟''حیدر نے دوبارہ اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا تو ویٹر نے انہیں راستہ سمجھا دیا۔

بل ادا کر کے تینوں دوست ہوٹل سے باہر نکلے۔علی اور حیدر جانتے تھے کہ عثمان بہت کچھ ان سے کہنا

چاہتا ہے لیکن باوجود سعی کے وہ چپ ہے۔

''زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی اگر ہم لوگ کامیاب لوٹے تو؟'' حیدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر لوٹے تو؟'' عثمان بالآخر بول پڑا اور اس کی بات سن کر دونوں نے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

''یار کیا منہ لٹکا یا ہوا ہے؟'' علی پیچ و تاب کھا کر بولا۔ ''اس سے تو بہتر ہے تم نہ ہی ہمارا ساتھ دو۔ بجائے ہماری ڈھارس بندھانے کے ہمیں الٹا ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔''

جواباً عثمان نے چپ دھار لی۔ جلد ہی وہ ایک گھنے جنگل کے سامنے پہنچ گئے۔ جنگل دور سے ہی بڑا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر تینوں کے جسموں میں سرایت کر گئیں۔ لیکن تینوں نے اپنی کنڈیشن ایک دوسرے پر مترشح (واضح) نہ ہونے دی۔ جنگل کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حالانکہ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں جنگل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہیں۔ تینوں کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

''ہماری منزل ہم سے کچھ فاصلے پر ہے۔'' عثمان گویا ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔ ''یہاں کھڑے ہو کے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

دونوں دوستوں نے اس کی بات کی تصحیح کی اور تینوں جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔ دیوقامت اور گھنے درختوں نے جنگل کے اندر گھپ اندھیرا پیدا کیا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر تک تینوں دوست کھڑے رہے لیکن جلد ہی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو تینوں آگے بڑھے۔

ابھی انہوں نے بمشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ یکدم انہیں یوں لگا جیسے ان کے پیچھے کوئی چیز گری ہو۔ تینوں نے سرعت سے مڑ کر پیچھے دیکھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر تینوں کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

ان کے سامنے ایک عجیب وغریب شکل کا جانور کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔اس جانور کا منہ کتے کی مانند تھا لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی وہ بھی اس کے ماتھے کے اوپر۔اس کی آنکھ عام جانوروں کی آنکھ سے دوگنا بڑی تھی۔

اس کی زبان کتے کی مانند منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اوراس سے پیہم رال ٹپک رہی تھی۔وہ جانور کھا جانے والی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔تینوں دوستوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔بدحواسی کے عالم میں تینوں نے پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا۔علی اور حیدر کو پہلی بار اپنی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن انہوں نے ضد کر کے اپنی جان مصیبت میں ڈال دی تھی۔

''بھاگو۔'' یکدم عثمان چلایا اور جس کا منہ جس طرف لگا اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

اس عفریت نے کھا جانے والی آنکھوں سے تینوں کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے علی کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔علی اس بات سے انجان پیہم دوڑے جا رہا تھا کہ یکدم اسے رکنا پڑ گیا۔کیونکہ جس طرف وہ دوڑ رہا تھا۔سامنے سے وہ عفریت آ چکا تھا۔علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔عفریت نے لپک کر علی کو پکڑا اور ہوا میں اچھالا ایک سماعت شکن چیخ علی کے حلق سے برآمد ہوئی اور جنگل کے سکوت زدہ ماحول کا سینہ چیرتی چلی گئی۔علی جیسے ہی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آیا۔اس عفریت نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا لٹکا لیا دوسرے ہی لمحے اس عفریت نے علی کے دونوں پیروں سے پکڑ کر اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا۔علی کے حلق سے آخری سماعت شکن درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی۔اس عفریت نے اس کے جسم کے دونوں حصوں کو دائیں بائیں اچھال دیا اور ایک بار پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

دوسری طرف عثمان پیہم دوڑ رہا تھا کہ یکدم کسی سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا۔ گرتے ہوئے مدھم سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ گرتے ساتھ ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے سانس میں کچھ سانس آئی۔ اس سے ٹکرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ حیدر تھا۔ قبل اس کے کہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے علی کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

''بھاگو۔'' عثمان نے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

''علی۔'' حیدر نے بھاگتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔'' عثمان دوڑتے ہوئے بولا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے آگے پیچھے سرعت سے دوڑ رہے تھے۔ کافی دیر دوڑنے کے بعد جب عثمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے حواس باختہ رہ گئے کیونکہ حیدر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ دوموٹے موٹے گہرہائے آبدار اس کی آنکھوں کے پٹ کھولتے ہوئے نیچے جا گرے۔ ایک بار پھر اس نے رہی سہی ہمت یکجا کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ جلد ہی اسے روشنی دکھائی دینے لگ گئی۔ حتیٰ کہ اس خونی جنگل سے وہ باہر نکل آیا اور ایک چٹان پر بیٹھ کر تیز تیز سانس لینے لگا۔

اس کا سانس پھول چکا تھا۔ کافی دیر چٹان پر بیٹھ کر اس نے سانس بحال کیا اور جب کچھ سانس لینے میں بہتری آئی تو اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا رہ گئی۔ وہ اس غار کے دہانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ جس کے اندر نقشے کے مطابق خزانہ تھا۔ جہاں اسے دوستوں کے بچھڑ جانے کا ملال تھا۔ وہیں اسے خزانہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔

عثمان سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کی اور بڑھا۔ غار کے اندر سورج کی کرنیں جانے کی وجہ سے

کافی اجالا تھا۔عثمان آگے بڑھ رہا تھا۔تبھی اس کی نظر ایک طرف بڑے بڑے لکڑی کے صندوقوں پر پڑی۔عثمان خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔تبھی عثمان کی نگاہ ایک صندوق پر براجمان ایک ناگ پر پڑی۔ جس نے اپنا پھن پھیلایا ہوا تھا۔عثمان کو اپنے جسم میں دوڑتا لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانا نہ تھا جب اس نے سانپ کو باہر کی طرف نکلتے ہوئے دیکھا۔ جب ناگ غار سے باہر نکل گیا تو عثمان جلدی سے ان صندوقوں کی طرف بڑھا جیسے جیسے وہ صندوقوں کے ڈھکنے اتار کے دیکھ رہا تھا۔ ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔سارے صندوق لبالب ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔عثمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے صندوق لے کر چلتا بنے۔

اس نے ایک صندوق کا آخر انتخاب کیا۔اس کے اندر ہیرے جواہرات کا انبار لگا ہوا تھا۔عثمان جانتا تھا کہ وہ اتنا خزانہ تھا کہ اس کی درجنوں نسلیں پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لادا۔اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔خوابوں کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

عثمان نے ایک ٹھنڈا مگر لمبا سانس خارج کیا اور سر پر لادا ہوا صندوق بڑی مشکل سے اتار کر زمین پر رکھا۔اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔اس کے سامنے منظر ہی اتنا بھیانک تھا کہ اسے اپنی بھیانک موت مترشح دکھائی دے رہی تھی۔سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھن پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔سانپ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔

عثمان نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔اس کی آنکھوں میں اتھروآ گئے۔

''رکو میرے دوستوں مجھے بھی ساتھ لیتے جانا۔'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عثمان بولا اور پھر وہ خود کو موت کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا......؟

Downloaded from https://paksociety.com



"نہیں ساحر بھائی جھگڑا نہیں کرتے اور باقی سب تو ٹھیک ہیں لیکن سائرہ آپی آج کل بہت کم بولتی ہیں، اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں آتی اور اکثر روتی رہتی ہیں، میں نے سب سے پوچھا کہ سائرہ آپی کو کیا ہوا ہے لیکن کوئی کچھ نہیں بتاتا...... بھائی کیا آپ کو پتا ہے کہ سائرہ آپی کو کیا ہوا ہے"۔

"ہوں......نہیں ......اُجالا بیٹا آپ کو تو پتا ہے کہ میں ابھی لندن سے واپس آیا ہوں مجھے کیسے پتا ہوگا کہ سائرہ کو کیا ہوا ہے" اُس نے بات کو ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی۔

"پہلے وہ کتنا خوش رہتی تھی لیکن اب......" اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"اُجالا...... بیٹا آپ پریشان نہ ہو وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی اور پھر سے پہلے کی طرح خوش رہنے لگے گی"۔

''اور میرے ساتھ پہلے کی طرح کھیلا بھی کریں گی'' اُس کا چہرہ اچانک خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔

''ہاں......''۔

''پرامس''۔

''پکا پرامس......ابھی تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کر آتا ہوں پھر کہیں گھومنے چلتے ہیں''۔

''آئس کریم کھانے چلیں گے'' اُس نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں تم کہو گی وہاں چلیں گے''۔

''ٹھیک ہے بھائی......میں نیچے آپ کا انتظار کر رہی ہوں آپ جلدی سے تیار ہو کر آ جائیں''۔

''ok'' اُجالا کے باہر جاتے ہی اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور واپس پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

وہ باہر سے تھکا ہوا آیا اور آتے ہی ہال میں پڑے ہوئے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

'' فہد بھائی'' جیسے ہی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے مائرہ تھی (سائرہ کی چھوٹی بہن)۔

''آؤ مائرہ بیٹھو......'' اُس نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

'' فہد بھائی میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ سائرہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے''۔

''سب ٹھیک تو ہے سائرہ نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے'' سائرہ کے بلاوے نے اُسے سوچ میں ڈال دیا تھا۔

''یہ تو اُس نے نہیں بتایا لیکن وہ سٹڈی روم میں آپ کا انتظار کر رہی ہے''۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ میں سٹڈی روم میں جا رہا ہوں'' مائرہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور وہ سٹڈی روم کی

طرف ہولیا۔

☆......☆......☆

''آجائیں'' دروازے پر دستک ہوئی تو اُس نے اندر سے جواب دیا۔

''السلام وعلیکم'' اُس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''واعلیکم السلام'' اُس نے بجھے سے انداز میں جواب دیا۔

''جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا مجھے اُس کا بے حد افسوس ہے'' اُس نے مشکل سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اب تو چار مہینے گزر گئے اس بات کو اور آپ اب افسوس کر رہے ہیں'' اُس نے نم آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا تو شرم سے اُس کا سر جھک گیا۔

''میں تو پہلے ہی آنا چاہتا تھا لیکن پھر تم عدت میں تھی اس لیے میں......''

''خیر جو ہونا تھا ہو گیا......کیا آپ جانتے ہیں کہ گھر والے اس جمعے کو ہمارا نکاح کروانا چاہتے ہیں''۔

''ہاں میں جانتا ہوں'' اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ اس فیصلے سے خوش نہیں ہیں ماموں نے زور زبردستی سے آپ کو منایا ہوگا'' اُس نے فہد کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

''میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو کوئی میرے ساتھ زور زبردستی کرے گا اور رہی بات میری خوشی کی تو جس فیصلے سے گھر والے خوش ہیں اس میں میری بھی خوشی ہے''۔

''لیکن میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی'' اُس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا کمی ہے مجھ میں'' وہ اُس کا جواب سن کر دنگ رہ گیا تھا۔

''آپ میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میں منحوس ہوں اگر میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو گیا تو......'' بالآخر اُس نے اپنا خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

''میں ان بکواس باتوں پر یقین نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اللہ کی اشرف بنائی ہوئی چیز منحوس تو نہیں ہو سکتی''۔

''لیکن اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو......'' اُس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

''مجھے جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا اس لیے اپنے دماغ سے سارے وہم نکال دو......اور ہاں لوگ جو کہتے ہیں اُنھیں کہنے دو مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمھیں بھی نہیں پڑھنا چاہیے'' اُس نے غصیلے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

جمعہ کے مبارک روز نکاح کی تیاری کی گئی تھی۔ فضیلہ کی خوشی تو دیدنی تھی اور باقی سب بھی بہت خوش تھے لیکن یہ خوشی صرف چند لمحوں کی ثابت ہوئی۔ عمر اور ساحر جس جھومر کے نیچے کھڑے ہو کر باتیں کر رہے تھے کہ اچانک جھومر کی رسی کھل گئی اور وہ نیچے آن گرا۔ وہ تو عین اُسی وقت ساحر کی نظر جھومر پر پڑھ گئی اور اُس نے فہد کو دھکا مارا اور خود بھی دور جا گرا لیکن فہد کا سر ٹیبل سے ٹکرا گیا اور وہ وہیں بے خوش ہو گیا۔ محمود صاحب اور ساحر نے اُسے اُٹھایا اور ہسپتال لے گئے اور یہاں مسز محمود اور سائرہ کا رو رو کر بُرا حال تھا۔

''ارے بھابھی ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ لڑکی منحوس ہے ارے پہلے ہی اپنے سابقہ شوہر کو کھا چکی ہے اور اب آپ کے بیٹے کے ساتھ رشتہ جڑنے والا تھا کہ وہ ہسپتال پہنچ گیا'' حالات کا فائدہ اُٹھا کر ایک عورت مسز محمود کے پاس آئی اور اُن کہ کان بھرنے لگی۔

''زرا سوچیے اگر یہ نکاح ہو گیا تو آپکا بیٹا تو......''۔ ''باقی ہمارا کام تو صلاح دینا تھا ماننا یا نہ ماننا آپ کی مرضی

ہے''۔اُس عورت کی باتوں کا مسز محمود پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ وہ بھی سوچ میں پڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

نکاح کا پروگرام کینسل کردیا گیا تھا سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے لیکن مسز محمود ابھی تک پریشان بیٹھی ہوئی تھیں۔

''بھابھی ہسپتال سے کوئی خبر آئی'' فضیلہ نے مسز محمود سے پوچھا جو اپنے خیالوں میں گم تھی۔

''ہاں ساحر کا فون آیا تھا فہد اب پہلے سے بہتر ہے صبح تک گھر واپس آجائے گا''۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں ابھی یہ بات جا کر سائرہ کو بتاتی ہوں وہ تو اُس وقت سے کافی پریشان ہے''۔

''فضیلہ......بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے'' فضیلہ مڑ کر جانے لگی تو مسز محمود نے اُسے روکا۔

''جی بھابھی کہیے......'' انھوں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

دیکھو فضیلہ مجھے غلط مت سمجھنا......لیکن میں چاہتی ہوں کہ فہد اور سائرہ کے نکاح والی بات کو یہیں ختم کردیا جائے''۔

''بھابھی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں'' فضیلہ نے حیرت بھری نگاہوں سے مسز محمود کو دیکھا۔

''تم تو جانتی ہو کہ سائرہ کے بارے میں لوگ شروع سے ہی باتیں کررہے ہیں لیکن ہم لوگوں نے پھر بھی اُن سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سائرہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا لیکن جو کچھ بھی ہوا وہ تمھارے سامنے ہے''۔

''تو بھابھی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کہ یہ سب میری بیٹی کی وجہ سے ہوا ہے'' فضیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے مسز محمود کی طرف دیکھا۔

''میں کسی کو الزام نہیں دے رہی میں تو بس تمھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کررہی ہوں کہ یہ شادی اب نہیں ہوگی

اور میں فہد کو کل واپس لندن بھیج رہی ہوں''۔

''تو صاف صاف کہیے نہ کہ آپ نے بھی لوگوں کی طرح سائرہ کو منحوس سمجھ لیا ہے''فضیلہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''اگر تم نے یہی سمجھنا ہے تو یہی سہی لیکن یہ شادی اب نہیں ہوگی میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا''۔مسز محمود نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا اس بات سے بے خبر کہ پیچھے سیڑھیوں پر کھڑی سائرہ سب کچھ سن رہی تھی۔

☆......☆......☆

سورج طلوع ہو چکا تھا اور سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہو گئے تھے۔

''بشرہ تم نے فہد کے کمرے میں ناشتہ بھجوا دیا''مسز محمود نے اپنی ملازمہ کو مخاطب کیا۔

''جی بیگم صاحبہ فہد صاحب ابھی سو رہے ہیں جب اُٹھ جائیں گے تو ناشتہ دے آؤں گی''۔

''ٹھیک ہے''۔

''ارے بھئی آج یہ سائرہ بیٹی کہاں رہ گئی روز تو وہ سب سے پہلے اُٹھ جاتی ہے اور کھانا بھی خود پیش کرتی ہے''محمود صاحب کو سائرہ کی غیر موجودگی ناگوار گزری تھی۔

''بھائی جو کچھ بھی کل ہوا اُس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھی اسی لیے رات کو دیر سے سوئی ہوگی اُسے رہنے دے اپنے کمرے میں آپ لوگ کھانا شروع کیجیے''۔

''امی میں کب سے دروازے پر دستک دے رہی ہوں لیکن سائرہ باجی نہ تو دروازہ کھول رہی ہیں اور نہ ہی کچھ بول رہی ہیں''جیسے ہی وہ کھانا شروع کرنے لگے مائرہ بھاگتی ہوئی آئی اُس کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

''یا اللہ خیر......میری بچی کو کچھ ہو تو نہیں گیا''فضیلہ نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سب بے اختیار سائرہ کے کمرے کی جانب بھاگے فہد بھی شور سن کر اپنے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

''سائرہ...... بیٹا دروازہ کھولو'' فضیلہ نے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''بشرہ جاؤ اور میرے کمرے سے چابیاں لے کر آؤ'' مسز محمود نے ملازمہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''چابیاں ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے امی یہ دروازہ ہی توڑنا پڑے گا'' ساحر اور محمود صاحب نے مل کر دروازے کو چھ سات دھکے دیے تو ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ سائرہ سامنے بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی اور اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ فضیلہ بیگم کی تو یہ دیکھ کر جان ہی حلق میں آ گئی تھی۔ مائرہ نے بھاگ کر اُسے سیدھا کیا اور اُس کے اوپر چادر اُوڑھ دی۔

''مجھے لگتا ہے کہ سائرہ باجی نے چوہے مار گولیاں کھالی ہیں'' ملازمہ نے اپنا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم بشرہ......'' مسز محمود نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں کل رات کو وہ کچن میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں میں نے پوچھا تو مجھے کہہ دیا کہ ماچس ڈھونڈ رہی ہوں جبکہ ماچس سامنے پڑی ہوئی تھی''۔

''یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے ساحر بیٹا جلدی سے گاڑی نکالو ہمیں سائرہ کو اسی وقت ہسپتال لے کر جانا ہوگا''۔

''بابا میں نے ڈاکٹر جبار کو فون کر دیا ہے وہ آنے ہی والے ہونگے''۔

☆......☆......☆

''معافی چاہتا ہوں لیکن سائرہ بیٹی کی روح تو کب کی پرواز کر چکی ہے'' ڈاکٹر جبار نے بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا فضیلہ بی بی کی حالت تو غیر ہو رہی تھی، سب لوگ حیران تھے کہ سائرہ

جیسی معصوم لڑکی اتنا بڑا اقدم کیسے اُٹھا سکتی ہے۔خبر سنتے ہی آس پڑوس کے لوگ بھی تعزیت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

''بہت دکھ ہوا فضیلہ بہن یہ سن کر آخر تمھاری بھابھی نے تمھاری بیٹی سے اپنی جان چھڑا ہی لی'' ایک عورت نے فضیلہ بی بی سے تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب'' فضیلہ بی بی نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم تو بہت ہی بھولی ہو بہن ارے تمھاری بھابھی تو شروع سے ہی سائرہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھی وہ تو محمود بھائی کی وجہ سے خاموش تھی ارے وہ تو کئی بار مجھ سے اس بات کا اظہار کر چکی ہیں اور تو اور میں نے اُنھیں ایک بابا سے تاویز لیتے ہوئے بھی دیکھا تھا''۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم......'' فضیلہ نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''تمھارا دکھ بہت بڑا ہے بہن ابھی تم کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی چند روز گزر جانے دو پھر تفصیل سے سمجھاؤں گی ابھی میں چلتی ہوں خدا تمھیں یہ دکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دے بہن......'' فضیلہ تو پہلے ہی مسز محمود کے خلاف تھیں ہمسائی کی باتوں نے جلتی پر تیل چھڑ کنے کا کام کیا۔

☆......☆......☆

''یقین نہیں آتا کہ اس زمانے میں بھی ایسے تقیانوس لوگ پائے جاتے ہیں'' ماہم کو زمانے کی بے حسی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''لوگوں کی باتوں نے اُسے ذہنی طور پر اتنا پریشان کر دیا تھا کہ اُس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی''۔

''کیا تمھاری کزن نے صرف اس لیے اپنی جان دے دی کیونکہ لوگ اُسے منحوس کہتے تھے'' اُسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

''پتا نہیں اُس نے اتنا بڑا اقدم کیوں اُٹھایا لیکن اُس کے لکھے ہوئے اُس ایک خط نے میری پوری زندگی بدل کہ رکھ دی''۔

''کونسا خط اور کیا لکھا تھا اُس خط میں ...؟''۔

''سائرہ نے مرنے سے پہلے ایک خط لکھا تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ......اُس نے میری وجہ سے خودکشی کی ہے''۔

''کیا تمھاری وجہ سے......''؟ ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔

''ہاں میری وجہ سے'' اُس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

فضیلہ بہن آپ نے مجھے بلایا تھا' وہ آرام کی غرض سے لیٹی ہوئیں تھی کہ کان میں پڑھنے والی آواز سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آؤ نسیم میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی'' فضیلہ نے اُسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

''اب بتاؤ مجھے اُس دن تم کیا کہہ رہی تھی''۔

''میں تو وہی کہہ رہی تھی جو میں نے دیکھا اور سنا تھا' وہ عورت اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

''پہیلیاں مت بجھاؤ صاف صاف بتاؤ کیا دیکھا تھا تم نے'' فضیلہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔

''فضیلہ بہن یہ جو تمھاری بھابھی ہے نہ یہ کوئی عام عورت نہیں بلکہ بہت ہی چالاک ہے اس نے ہی تمھاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا تھا اور تو اور تمھارے داماد پر بھی اسی نے کالا جادو کروایا تھا میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے ایک بابا سے تاویز لیتے دیکھا تھا''۔

''بھابھی یہ سب کیوں کریں گی'' فضیلہ کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن اگر تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں تو میں تمھیں اُس بابا کے پاس لے جاؤں گی جس سے تمھاری بھابھی نے تاویز لیے تھے شاید وہ تمھارے سوال کا جواب دے سکے''۔

''ٹھیک ہے کل صبح دس بجے آ جانا پھر ہم اُس بابا کے پاس جائیں گے فضیلہ کو اب بھی اُس کی باتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا''۔

ٹھیک ہے بہن میں پورے دس بجے آ جاؤں گی لیکن تم اپنے ساتھ اپنی بھابھی کی کوئی تصویر لے لینا اور کچھ پیسے بھی لے لینا''۔

''کیوں تصویر کی کیا ضرورت ہے''؟۔

''ارے فضیلہ بہن وہ بابا بہت ہی مشہور ہے اُس کے پاس دن میں بہت سے لوگ آتے ہیں تو اُسے پہچاننے کے لیے تصویر کی ضرورت ہوگی''۔

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور کل صبح دس بجے آ جانا'' فضیلہ نے اُسے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جاتی ہوں''۔

☆......☆......☆

''یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو نسیم، اتنا گندہ راستہ ہر طرف جھاڑیاں، جانوروں کی ہڈیاں یہ کس واہیات جگہ رہتا ہے بابا'' اُس نے اپنی ناک کہ آگے دوپٹہ رکھا ہوا تھا۔

''فضیلہ بہن یہ کالے جادو والے بابے اسی طرح گندی جگہوں پر رہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ ایسی جگہوں پر رہنے سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے''۔

''یہ لوگ اپنی طاقت بڑھاتے ہیں تا کہ معصوم لوگوں کی زندگیاں برباد کر سکیں''۔

''وہ دیکھو فضیلہ بہن [illegible]

''میں اپنی بھابھی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ ایسی گندی جگہ پر کبھی بھی نہیں آ سکتی''۔

اب دروازے تک آ چکی ہو تو اندر آ کر ایک بار بابا سے مل لو پھر اُس کے بعد ہی فیصلہ کرنا کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ......''۔

''سلام بابا...... یہ میری بہن فضیلہ ہے وہ جو عورت آپ سے تاویز لے کر گئی تھی نہ یہ اُس کی نند ہے''۔

''ہمارا کام تو لوگوں کی خدمت کرنا ہے اور میرے پاس تو دن میں بہت سے لوگ آتے ہیں مجھے کیا معلوم کہ تو کس عورت کی بات کر رہی ہے'' بابا نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

''بابا میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں'' اُس نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ عورت...... ہاں یہ میرے پاس آئی تھی اپنی بیٹی کے لیے تاویز لینے کے لیے'' بابا نے اپنے محسوس سے انداز میں کہا۔

''اُس کی بیٹی تو بالکل ٹھیک ہے پھر اُسے تاویز لینے کی کیا ضرورت ہے'' فضیلہ بی بی نے خیرت بھری نگاہوں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

''تمھیں اس بات سے کیا لینا دینا...... جاؤ بی بی اپنا کام کرو''۔

''بابا اُس عورت نے آپ سے جھوٹ بولا تھا اُس نے آپ سے جو تاویز لیے تھے اُن تاویزوں سے اُس نے میری بہن کی بیٹی کی جان لے لی ہے'' نسیم نے فضیلہ کے درد کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو بی بی......؟''۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں بابا اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ اُس نے آپ سے وہ تاویز کس لیے تھے آپ جتنے پیسے کہیں گے میں آپ کو دوں گی لیکن خدا کے لیے مجھے سچ بتا دیجئے''۔

''اُس عورت نے مجھے کہا تھا کہ اُس کی ایک سات سال کی بیٹی ہے جس پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے اس لیے

میں نے اُسے تاویز دیئے تھے کہ وہ کسی طرح یہ اُس عورت کو کھلا دے جس نے اُس کی بیٹی پر جادو کیا ہے اس سے اُسکی بیٹی پر سے جادو کا اثر ختم ہو جائے گا اور اُس عورت پر الٹا اثر شروع ہو جائے گا'' بابا نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''بابا جو تاویز آپ نے اُس عورت کو دیئے تھے اُس سے کیا اثرات ہو سکتے تھے''۔

''جو بھی وہ تاویز کھائے گا وہ بے چین ہو جائے گا اور اُس کی زندگی سے خوشی کے اُجالے دور اور غم کے سائے چھانے لگے گے اور وہ جو چیز چاہے گا وہ اُس سے دور ہو جائے گی اور لوگ اُس سے نفرت کریں گے اور اُس کی شکل بھی نہیں دیکھنا گوارہ کریں گے''۔

''کیا لوگ اُسے منحوس بھی سمجھے گے''نسیم نے اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں لوگ اُسے منحوس سمجھے گے اور اُس سے دور ہی رہیں گے'' بابا نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''فضیلہ بہن یہی سب تو ہماری سائرہ کے ساتھ ہوتا رہتا تھا''نسیم اور بابا کی باتیں سُن کر فضیلہ کا ذہن مزید الجھ گیا تھا۔

''مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری بیٹی سے اُس کی کیا دشمنی تھی''۔

''یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ کس بات کا بدلہ لیا ہے اُس نے تم سے لیکن جو بھی تمھاری بھابھی نے کیا ہے وہ بہت غلط ہے اور میرے خیال سے تمھیں اس کا بدلہ ضرور لینا چاہیے''نسیم نے اُسے ورغلانے کی کوشش کی۔

''چلو میرے ساتھ میں ابھی جا کر بھائی کو بتاتی ہوں کہ اُس کی بیوی یہ سب کیا کرتی پھر رہی ہے''۔

''فضیلہ بہن رکو یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ محمود بھائی ان سب باتوں میں یقین نہیں کرتے اور تو اور اس بات کا تمھارے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے''۔

''تو پھر میں کیا کروں اُس عورت نے میری بیٹی کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی اور تم چاہتی ہو کہ میں اُسے چھوڑ دوں میں اُس ناگن کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گی'' فضیلہ نے غصیلے انداز میں کہا۔

''ارے فضیلہ بہن اپنے ہاتھوں سے اُسے ماردو گی تو خود بھی جیل چلی جاؤ گی جب ہمارے پاس کالے جادو جیسا ہتھیار ہے تو تمھیں اپنے ہاتھ خون سے رنگنے کی کیا ضرورت ہے'' اُس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا'' فضیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

''تم چلو میرے ساتھ میرے گھر میں تمھیں سب کچھ سمجھاتی ہوں''۔

☆......☆......☆

''ہاں نسیم اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو'' فضیلہ نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے فضیلہ بہن پہلے آرام سے بیٹھ تو جاؤ پھر سب کچھ سمجھاتی ہوں''۔

''دیکھو تمھاری بھابھی سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے بھی وہی تکلیف دو جو اُس نے تمھیں دی ہے'' نسیم نے اُس کے پاس چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو''۔

''مطلب یہ کہ اگر تم اُسے مار دیتی ہو تو یہ تو اُس کے لیے ایک بہت ہی چھوٹی سی سزا ہو گی تمھارا بدلہ صرف اسی صورت پورا ہو سکتا ہے کہ تم بھی اُس کے ساتھ وہی سب کرو جو اُس نے تمھارے ساتھ کیا ہے''۔

''مجھے اب بھی تمھاری بات کی کوئی سمجھ نہیں آئی'' فضیلہ اُس کی پہیلیوں سے تھک چکی تھی۔

''ارے تم تو واقعی ہی بہت بھولی ہو میرا مطلب ہے کہ اگر اُس نے تمھیں اولاد کا دکھ دیا ہے تو تم بھی اُسے اولاد کا دکھ دو'' اب اُس نے کھل کر وضاحت کی تھی۔

''تم کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنی سائرہ کا بدلہ لینے کے لیے اُجالا کی جان لے لوں ......تم نے یہ سوچا بھی کیسے وہ معصوم بچی ہے میں کیسے اس کی جان لے سکتی ہوں'' فضیلہ غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو کیا تمھاری سائرہ معصوم نہیں تھی اُس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا'' نسیم نے اُسے جذبات میں لانے کی کوشش

کی۔

”لیکن میں پھر بھی کسی کی جان نہیں لے سکتی“ فضیلہ نے ایک بار پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”اگر تم اُس کی جان نہیں لینا چاہتی تو تمھاری بھابھی سے بدلہ لینے کا ایک طریقہ اور بھی ہے“۔

”وہ کیا......“ فضیلہ نے غور سے نسیم کو دیکھا۔”اُس نے تو تم سے ایک بیٹی دور کی ہے تم اُس کے تینوں بچوں کو اُس سے دور کر دو میرا مطلب یہ ہے کہ اُن سب کے دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پیدا کر دو یعنی کے اُس کے بچے زندہ بھی رہیں گے اور اُسے اولاد کی خوشیاں بھی نصیب نہیں ہونگی اور اس کی شروعات ہم فہد سے کریں گے“۔

”ہاں یہ طریقہ ٹھیک ہے اس سے کسی کی جان بھی نہیں جائے گی اور میرا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا“۔

وہ اپنے کمرے میں نیند کی وادیوں میں گم تھا کہ اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کے شور سے وہ اُٹھ گیا۔

”فہد......دروازہ کھولو میں تمھیں جان سے مار دوں گا“ محمود صاحب زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔

فہد نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو محمود صاحب نے تھپڑ مارنا شروع کر دیے اور اُسے کمرے سے گھسیٹ کر باہر لے آئے۔

”بابا آپ مجھے اس طرح مار کیوں رہے ہیں......میں نے کیا کیا ہے؟“۔

”بے غیرت تجھے یہ سب کرتے ہوئے زرا بھی شرم نہیں آئی“ محمود صاحب اُسے مارتے جا رہے تھے اور بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

”بابا یہ آپ کیا کر رہے ہیں آخر بھائی نے کیا کیا ہے جو آپ اُنھیں اتنی بری طرح سے پیٹ رہے ہیں“ ساحر نے محمود صاحب سے فہد کا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔

”کیا کیا ہے [illegible] ایک

دفعہ پھر سے اُسے دبوچنے کی کوشش کی۔

''یہ سب جھوٹ ہے''فہد نے اپنا جرم ماننے سے انکار کردیا۔

''مرنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور یہ رہا تمھارے گناہ کا ثبوت''محمود صاحب نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور فہد کی جانب پھینکا۔

فہد نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

''پیاری امی جان مجھے معاف کردیں کے میں آپ کو اور مائرہ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں، میں تھک گئی ہوں لوگوں کی باتیں سن سن کر اور اب تو مجھے خود بھی لگنے لگا ہے کہ میں منحوس ہوں۔لوگ تو پہلے بھی باتیں کرتے تھے لیکن میں نے اُن کی کبھی پرواہ نہیں کی لیکن آج صبح جب فہد ہسپتال سے واپس آیا تو وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے کھری کھری سنانے لگا جیسے اُس پر جھومر میں نے گرایا ہو،اُس نے مجھے یہ احساس کروایا کہ میں واقعی منحوس ہوں۔وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور ماموں اپنے فیصلے کو بدلنے والے نہیں اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری یہ منحوسیت آپ میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے اس لیے میں آپ سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

سائرہ''

''بابا میرا یقین کریں یہ سب جھوٹ ہے میں اُس دن سائرہ سے ملا بھی نہیں تو یہ سب کیسے کہہ سکتا ہوں''۔

''دیکھ لیں اپنے بیٹے کی حرکت بھائی صاحب پہلے تو میری بیٹی کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور اب میری مری ہوئی بیٹی پر بہتان باندھ رہا ہے''۔

''پھوپھو میرا یقین کریں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے سائرہ سے یہ سب نہیں کہا پتا نہیں اُس نے ایسا کیوں......میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا''اُس نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن میری سمجھ میں آ گیا ہے تم پہلے ہی اُس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے تم نے اُس سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کچھ کیا'' فضیلہ نے جلتی پر تیل پھینکا۔

''دفعہ ہو جا میری نظروں سے ورنہ میں تیری جان لے لوں گا'' محمود صاحب ایک بار پھر جوش میں آ گئے۔

''خدا کا خوف کریں جوان بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں'' مسز محمود نے دخل اندازی کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں ہے یہ میرا بیٹا مر گیا ہے یہ آج سے ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے......میرے لیے تو پہلے ہی تیرے دل میں کوئی عزت نہیں تھی لیکن اگر تیری ماں اور بہن بھائیوں کے لیے کوئی پیار ہے تو دفعہ ہو جا اس شہر سے اس ملک سے اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا'' محمود صاحب نے آگ بھگولا ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سب سُن کر تو فہد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی ساحرا اور مسز محمود نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بوجھل قدموں سے گھر سے نکل گیا اور پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آیا۔

☆☆☆

''تم نے اپنے بابا کی باتوں کو اتنا سیریس لے لیا کہ آٹھ سال گزر گئے ایک بار بھی واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی'' ماہم کو اُس کی اس حرکت پر بہت خیرت ہوئی تھی۔

''تم میرے بابا کو نہیں جانتی ماہم جب وہ ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر کچھ بھی ہو جائے وہ کبھی اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتے''۔

''لیکن ہو سکتا ہے یہ سب کچھ اُنھوں نے غصے میں کہہ دیا ہو'' ماہم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''لندن واپس آنے کے ایک مہینے بعد ایک دفعہ بڑی ہمت کر کہ گھر پر فون کیا تھا لیکن اتفاق سے بابا نے فون اُٹھا لیا اور اُنے میری آواز پہچان لی اور مجھ سے کہا کہ اگر میں نے دوبارہ اُنھیں فون کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان دے دیں گے، اس لیے میں نے اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا اور ایک کمپنی میں نوکری کر لی اور پھر میری

ملاقات تم سے ہوئی اور میں نے تم سے شادی کر لی اور یہیں لندن میں اپنا گھر آباد کر لیا'' اُس نے موڈ کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

''چلو مانا کہ بابا نے تو تمھیں منع کر دیا تھا لیکن کیا تم نے کبھی امی، ساحر اور اُجالا کی بھی خبر لینے کی کوشش نہیں کی''۔

''دو تین مہینے تک ایک دوست کی مدد سے گھر والوں کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی پھر اُس کی بھی نوکری دوبئی میں لگ گئی تو خبر آنا بھی بند ہو گئی''۔

''ذرا سوچو فہد وہ اُجالا جو تم سے کبھی دور نہیں رہ سکتی تھی تم آخری بار اُسے مل کر بھی نہیں آئے وہ کتنا روتی ہو گی تمھیں یاد کر کے تمھیں نہیں لگتا کہ ہمیں ایک بار پاکستان جانا چاہیے اُن سے ملنے کی کوشش کرنی چاہیے'' ماہم نے اُس کے غم کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔

''وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے ماہم اب دیکھو نہ میں بھی تو اُن کے بغیر پچھلے آٹھ سال سے رہ رہا ہوں اسی طرح اُن کو بھی میرے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہو گی پھر یوں اچانک اُن کے سامنے جا کر میں اُن کے پرانے زخم تازہ نہیں کرنا چاہتا، اس لیے اب چپ چاپ یہ کیک کھاؤ اور جا کہ سو جاؤ''۔

''لیکن فہد......''۔

''پلیز ماہم مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں تم جا کہ سو جاؤ'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فہد کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ماہم اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ کافی کا کپ ہاتھ میں تھامیں سوچوں میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

''ارے فضیلہ بہن یہ لو میں بابا سے تاویز لے آئی ہوں'' اُس نے جیب کہ سے تاویز پکڑاتے ہوئے کہا۔'' بابا

کہہ رہے تھے کہ یہ تاویز پانی میں گھول کر پلا دینا پھر دیکھنا اسے پینے والا کیسے تمھارے اشارے پر ناچتا ہے''۔

''بہت اچھے نسیم تمھارا بہت شکریہ'' اُس نے تاویز کو اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔

''یقیناً یہ تاویز تم محمود بھائی کو پلانے والی ہو'' نسیم نے ہوا میں تیر چلانے کی کوشش کی۔

''نہیں یہ تاویز میں نے اپنی بیٹی مائرہ کے لیے منگوایا ہے''۔

''کیا تم اپنی ہی بیٹی کو تاویز دو گی لیکن کیوں......'' اُس کی آنکھوں میں خیرت عیاں تھی۔

''کیونکہ مائرہ اور سائرہ کی لکھائی بالکل ایک جیسی ہے میں مائرہ سے خط لکھواؤں گی اور پھر وہ خط محمود بھائی کو دے دوں یہ کہہ کر کہ یہ مجھے سائرہ کے کمرے سے ملا ہے''۔

''اُس سے کیا ہوگا'' نسیم جاننے کے لیے بے چین تھی۔

اُس کے بعد جو ہوگا اُسکا تو تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتی تم تو بس دیکھتی جاؤ اب میں میں ان لوگوں سے اپنی بیٹی کا بدلہ کیسے لیتی ہوں''۔

☆☆

''السلام وعلیکم اینڈ گڈ مارننگ''......''اُٹھ جاؤ میری پیاری چڑیل اپنی سالگرہ کے موقع پر بھی کوئی اتنی دیر تک سوتا ہے'' اس وقت اُس کا موڈ بالکل فریش تھا۔

''تمھیں یاد تھا کہ آج میری سالگرہ ہے'' اُس نے بجھے سے انداز میں کہا۔

''تمھاری سالگرہ میں کیسے بھول سکتا ہوں صرف ایک دن کا ہی تو فرق ہے تمھاری اور اُجالا کی سالگرہ میں''۔

''تمھیں میری سالگرہ اس لیے یاد ہے کیونکہ اُجالا کی سالگرہ بھی مارچ میں ہی ہے'' کل والی بات کا غصہ ابھی تک قائم تھا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ تو بس......''

''بس کرو فہد آخر کب تک تم اپنے آپ سے اور مجھ سے جھوٹ بولتے رہو گے تمھارا کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جس میں اُجالا نہ ہو، ہمارے گھر کو دیکھ لو اس گھر میں اتنی تصویریں ہماری نہیں ہیں جتنی اُجالا کی ہیں، تمھارے دل میں اتنی جگہ میری نہیں ہے جتنی اُجالا کی ہے، بس کرو اب ختم کرو اس قصے کو یا تو مکمل طور پر بھول جاؤ سب کچھ یا پھر واپس چلے جاؤ اُن کے پاس'' ماہم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''ماہم تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ان دونوں میں سے کوئی بھی کام نہیں کر سکتا''۔

''فہد مجھے تمھاری ان حرکتوں سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جلن ہوتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ تم بار بار اپنے بہن بھائیوں کا میرے سامنے اس لیے ذکر کرتے ہو تا کہ تم مجھے یہ احساس کروا سکو کہ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے'' اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ماہم یہ تم کیا کہہ رہی ہو میں تمھیں تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا'' اُس کے لہجے میں محبت عیاں تھی۔

''اگر تم واقعی مجھے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے اور مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو پلیز مجھے پاکستان لے چلو'' اُس نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''ماہم یار تم یہ کیا نئی ضد پکڑ کر بیٹھ گئی ہو'' اُس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''فہد میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمھیں گھر جانے کے لیے مجبور نہیں کروں گی ہم صرف سات دن کے لیے پاکستان جائیں گے اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے''۔

''کیا کرو گی تم پاکستان جا کر'' وہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔

''وہاں جا کر ہم اُجالا اور ساحر سے ملیں گے'' اُس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

''اور اگر اُنھوں نے تمھیں ملنے سے انکار کر دیا تو''۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی فی الحال تم ... انکار نہ کرو'' [illegible]

''ٹھیک ہے اگر تمھاری یہی ضد ہے تو چلتے ہیں'' اُس نے بالآ کر ہار مان ہی لی۔

''تھینک یو سو مچ'' اُس نے تشکر بھری نگاہوں سے فہد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''دیکھا فضیلہ بہن فہد کے جانے کے بعد تمھاری بھابھی کیسے ادھ موئی ہو گئی ہے''۔

اب اُسے میری تکلیف کا کچھ تو اندازہ ہوا ہو گا'' فضیلہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''ابھی اُسے خاک اندازہ ہوا ہو گا ابھی تو صرف ہماری پہلی کاوش کامیاب ہوئی ہے ابھی تو ہمیں دو اور وار کرنے ہیں''۔

''کیا مطلب......؟'' اُس نے نسیم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ فہد کے بعد اب ساحر کی بھاری ہے''۔

''نہیں ہم ساحر کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گے'' فضیلہ نے ساحر کا نام سنتے ہی ٹکا سے جواب دیا۔

''ارے تم تو بہت ہی رحم دل ہو جس عورت نے تمھاری بیٹی کو مار ڈالا اُس کے بچے کے لیے بھی تمھارے دل میں کتنا رحم ہے'' نسیم نے پھر سے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''بات رحم کی نہیں ہے دراصل ساحر اور مائرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ایک بیٹی کی خوشیاں تو میں نہیں دیکھ سکی اب دوسری کی میں برباد نہیں کرنا چاہتی''۔

''یہ بات بھی ٹھیک ہے فضیلہ بہن لیکن اب اُجالا کے لیے اپنے دل میں رحم نہ پال لینا یہ بات جان لو کہ اُجالا میں اُس عورت کی جان اٹکی ہوئی ہے اگر اُسے زرا بھی تکلیف پہنچی تو وہ تڑپ کر رہ جائے گی''۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم واقعی اُجالا میں تو سب کی جان اٹکی ہوئی ہے''۔

''میں کل بابا کے پاس گئی تھی اُنھوں نے کہا کہ تم مجھے اُس لڑکی کے بال دے دو پھر دیکھو میرا کمال......''۔

''بال تو تمھیں مل جائیں گے لیکن یادرہے کہ اُس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے''۔

''ارے فضیلہ بہن یقین رکھو مجھ پر اس عمل سے بس اُس کے سر میں ہلکا سا درد اُٹھے گا لیکن وہ ہلکا سا درد بھی اُس مغرور عورت کی جان نکال دے گا''۔

''تو پھر ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ کل جاتے وقت مجھ سے اُجالا کے بال لے جانا'' فضیلہ نے اُسے چلتا کیا اور خود سوچوں میں گم ہو گئی''۔

☆☆☆

''کتنا اچھا لگ رہا ہے نہ اپنے ملک میں واپس آ کر'' اُس نے سامان صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو لگ رہا ہے لیکن ڈر بھی لگ رہا ہے''۔

''ڈرو مت فہد......اللہ سے اچھی اُمید رکھو'' اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ تعالیٰ کا ہی تو سہارا ہے......'' اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہم تو ہوٹل میں رکنے والے تھے نہ پھر تم مجھے کس کے گھر لے آئے ہو''۔

''یہ میرے دوست کا گھر ہے وہ سب ایک مہینے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں تو اُس نے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے''۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے'' اُس نے اپنے بیگ سائیڈ پر رکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اور تمھارے لیے ایک اور بھی اچھی خبر ہے'' فہد بھی اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''وہ کیا......'' اُس نے تجسس بھری نگاہوں سے فہد کی جانب دیکھا۔

''میرے اُس دوست سے مجھے ساحر کا نمبر بھی مل گیا ہے''۔

''تو پھر انتظار کس کا ہے......ابھی نمبر ڈائل کرو اور بات کرو'' اُس نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

''میں بعد میں بات کرلوں گا ابھی میں فریش ہونے جا رہا ہوں اور تم بھی فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھانے باہر چلتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے''۔فہد نے اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆

''ماہم میں تیار ہوں اور کتنی دیر انتظار......'' وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو ماہم کو کسی کے ہنس کر باتیں کرتا دیکھ وہ چونک گیا وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ ساحر تھا۔

''ساحر تم یہاں......'' اُس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا۔

''میری چھوڑو بھائی تم کہاں تھے اتنے سال کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمھیں'' اُس نے زور سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے ہو گئے ہو تم''۔

''جدائی نے صرف پچیس سال کی عمر میں ہی کتنا بوڑھا کر دیا ہے آپ کو'' اُس نے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔'' کیسے گزار لیے اتنے سال تم نے ہمارے بغیر''۔

''بس یار یوں سمجھ لو کہ ہر دن سو بار جیتا تھا سو بار مرتا تھا'' اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''مریں تمھارے دشمن ......جتنی جدائی لکھی تھی وہ ہم نے بھگت لی اب میں تمھیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا'' وہ بدستور اُس سے لپٹا ہوا تھا۔

''جانا تو میں بھی نہیں چاہتا لیکن جانا ہو گا...... تجھے یاد نہیں بابا نے کیا کہا تھا کہ اگر میں نے اُنھیں اپنی شکل بھی دکھائی تو وہ اپنی جان لے لیں گے اسی لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اتنے سال تم لوگوں سے دور رہا یہ تو ماہم کی تم لوگوں سے ملنے کی ضد تھی جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی ورنہ میں ساری زندگی واپس نہ

آتا“۔

”تب کی بات اور تھی بھائی اب تو سب گھر پہ آپ کا انتظار کرتے ہیں اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں“۔

”کیا......بابا......بھی“ وہ محمود صاحب کے دل کا حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔

”جی ہاں بابا، امی، میں اور مائرہ آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں“۔

”اور اُجالا......کیا وہ مجھے یاد نہیں کرتی“۔

”اُجالا............اگر ہوتی تو......ضرور یاد کرتی......“ اُس نے زرا ٹھہر کر جواب دیا۔

”کیا مطلب ہے تمھارا کہ ہوتی تو یاد کرتی......؟“ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے ساحر کی طرف دیکھا۔

”بھائی......اُجالا......اس دنیا میں نہیں رہی“۔

یہ سُن کر تو اُس کے قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی وہ ڈرام کرتا زمین پر جا گرتا اگر ساحر اور ماہم اُسے سہارہ نہ دیتے۔

☆☆☆

”فہد بیٹا آنکھیں کھولو......کب سے ترس رہی ہوں تمھاری آواز سننے کے لیے“ وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا اور مسز محمود اُس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔

”امی......کیا یہ کوئی خواب ہے یا واقعی آپ میرے سامنے ہیں“ آنکھ کھلتے ہی اُس نے مسز محمود کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

”کوئی خواب نہیں ہے بیٹا......“ مسز محمود نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

”میں کہاں ہوں......اور مجھے یہاں کون لایا“۔

”تم اپنے گھر میں ہو بیٹا......ساحر تمھیں یہاں لیکر آیا ہے“۔

''اُجالا......؟''اُس کے لہجے میں دکھ اور آنکھوں میں نمی تھی۔

''ہاں بیٹا......قسمت کو یہی منظور تھا اُجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی''مسز محمود کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھی۔

''جب میں گیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھی پھر اچانک کیا ہو گیا''۔

''کیا بتاؤں بیٹا تمھارے جانے کے بعد وہ بہت چپ چپ سی ہو گئی تھی شروع شروع میں تو ہم نے اُسے یہی بتایا کہ تمھارے امتحان ہونے والے تھے اس لیے تم واپس لندن چلے گئے ہو لیکن ایک دن اُس نے تمھارے بابا اور میری باتیں سن لی،اُس کے بعد وہ ہر وقت روتی رہتی اور تم سے ملنے کی ضد کرتی تھی''مسز محمود نے اپنی آنکھوں سے آنسوں صاف کرتے ہوئے کہا۔''اچانک ایک دن اُس کے سر میں شدید قسم کا درد اُٹھا اُس درد کی وجہ سے وہ ہر وقت تکلیف میں رہتی تھی اور پھر وہ تکلیف اُس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوئی''۔

''کس قسم کا درد تھا وہ......''ماہم نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں بیٹا ہم لوگ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس گئے بڑے بڑے ہسپتالوں کے چکر بھی لگائے لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا اور میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں بے بس اُسے دیکھتی رہی''مسز محمود کی آنکھوں میں ایک بار پھر سے آنسو اُمڈ آئے۔

''اپنے آپ کو سنبھالیے امی خدا کے فیصلوں کے سامنے ہم سب ہی بے بس ہوتے ہیں وہی خالق و مالک ہے اور جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے''ماہم نے مسز محمود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اور......بابا''فہد نے بھی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کہا۔

''بہن کی محبت میں آکر اولاد کی جدائی کا غم تو پہلے ہی دل پر تھا اوپر سے اُجالا کی موت نے ایسی ضرب لگائی کہ تمھارے بابا بستر سے ہی جا لگے......یکے بعد دیگرے دو بار اٹیک ہو چکا ہے جیسے اب تو جینے کی چاہت ہی ختم ہو گئی ہو''۔

''باباب کہاں ہیں'' اُس نے اپنے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں لیکن فہد بیٹا ابھی تم آرام کرو تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے''۔

''میں ٹھیک ہوں'' وہ محمود صاحب سے ملنے کے لیے بضد تھا اور اپنے کمرے سے نکلا اور سیدھا محمود صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا ماہم بھی اُس کے پیچھے چلی گئی۔

''بابا......'' اُس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا تو محمود صاحب آنکھیں موندیں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔

''فہد......'' اُس کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ اُچھل کر بستر سے نیچے اُتر آئے لیکن کمزوری کی وجہ سے ایک قدم چلنے کے بعد وہیں گر گئے''۔

''بابا......'' اُس نے بھاگ کر محمود صاحب کو سنبھالا اور گلے سے لگا لیا۔

''مجھے معاف کردو بیٹا میں نے تمھیں غلط سمجھا......'' محمود صاحب کو اپنے کیے پر پشیمانی تھی۔

''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے بابا......ماں باپ تو بچوں کو ڈانٹتے ہی ہیں لیکن بچے گھر چھوڑ کر تو نہیں جاتے اور میں تو ایسا گیا کہ آٹھ سال تک پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا یہ بھی نہیں سوچا کہ میرے بابا کو اس وقت میری سب سے زیادہ ضرورت ہے'' اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نہ رُکنے والا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

''بس اب تو تم آ گئے ہو نہ اب میں تمھیں کہیں نہیں جانے دوں گا'' ماہم اور مسز محمود بھی کمرے میں آ گئیں۔

''ارے آپ نیچے کیسے گر گئے......مسز محمود اُنھیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ''فہد بیٹا جلدی سے جاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ''۔

''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے'' محمود صاحب نے فہد کا سہارا لیا اور پھر سے بستر پر لیٹ گئے۔

''بابا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کہیں نہ جائیں تو آپ کو جلد سے جلد صحت یاب ہونا ہوگا یہ آپکے مریض بننے کی

عمر تو نہیں ہے'' ماہم نے محمود صاحب کے سر کے نیچے تکیہ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ پیاری سی بیٹی......'' محمود صاحب نے مسز محمود کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''جی بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے......یہ ماہم ہے آپ کی بڑی بہو'' مسز محمود نے ماہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ......خدا کرے کہ تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو'' محمود صاحب نے ماہم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''محمود صاحب یہی ہے جو فہد کو یہاں لے کر آئی ہے ورنہ شاید فہد تو ساری زندگی آپ کے غصے کا سامنہ کرنے کی ہمت نہ کرتا'' مسز محمود نے بھی پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''شکریہ بیٹا تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں اپنے بیٹے کی شکل دیکھے بغیر ہی نہ مر جاؤں''۔

''بابا خدا کے لیے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں ابھی تو میں آپ سب سے ملی ہوں اور آپ پھر سے بچھڑنے کی باتیں کر رہے ہیں'' اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''سوری بیٹا'' محمود صاحب نے بھی فوراً معذرت کی۔

''اچھا امی فہد نے مجھے مائرہ اور پھوپھو کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہ دونوں کہاں ہیں......؟'' ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے مسز محمود کی طرف دیکھا۔

''بیٹا مائرہ کی امی کی طبیعت کافی خراب ہے اس لیے وہ زیادہ وقت اپنی امی کے کمرے میں ہوتی ہے شائد ابھی بھی وہیں ہے''۔

''کیا ہوا ہے پھوپھو کو......''

''بیٹا فہد کی پھوپھو کو کینسر کا مرض ہے اور وہ بھی آخری سٹیج...... کچھ ماہ پہلے جب اُنھیں اس بیماری کا پتا چلا تو وہ بہت بے چین ہوگئی وہ اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتی تھیں اسی لیے اُنہی کی خواہش پر ہم نے مائرہ اور ساحر کی شادی بھی کروادی'' مسز محمود نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''بابا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پھوپھو سے ملنا چاہتا ہوں'' اُس نے محمود صاحب سے اجازت لی۔

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ'' فہد اور ماہم کمرے سے باہر چلے گئے اور محمود صاحب نے اپنی آنکھیں بند کرلی آج سالوں بعد اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اور سکون نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

''آجائیں دروازہ کھلا ہوا ہے'' اُس نے دروازے پر دستک دی تو اندر بیٹھی مائرہ نے آواز بلند کی۔

''ارے فہد بھائی آپ...... امی دیکھیں فہد بھائی آئے ہیں'' فہد اندر داخل ہوا تو مائرہ اُسے دیکھ کر بے اختیار فضیلہ کو جگانے لگی۔

''فہد بیٹا تم آگئے کب سے انتظار کررہی تھی میں تمھارا'' فضیلہ نے آنکھیں کھولیں تو اُسے اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

''پھوپھو یہ سب کیا ہوگیا'' اُسے فضیلہ کی یہ حالت دیکھ کر یقین نہ آیا۔

''یہ سب میرے کیے کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے'' فضیلہ کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

''لیکن میں نے تو کبھی بھی آپ کو بددعا نہیں دی''۔

''تم نے تو بددعا نہیں دی لیکن یہ اُس معصوم کی آہ ہے جس کی جان میری وجہ سے چلی گئی''۔

''کیا مطلب......'' فضیلہ کے باتیں اُس کے سر سے گزر رہی تھی۔

''اُجالا کی موت کی میں ذمہ دار ہوں'' فضیلہ کے منہ سے اتنی بڑی بات سُن کر سب کے منہ کھلے کہ

کھلے رہ گئے۔

''امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں'' مائرہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں بیٹا......'' فضیلہ اپنے گناہوں کا اقرار کر رہی تھی اور وہ تینوں کھڑے سُن رہے تھے

☆☆☆

''ارے نسیم ...... تجھے خدا کا خوف نہیں رہا یہ تو نے کیا کر دیا ایک معصوم بچی کی جان لیتے ہوئے تیرے ہاتھ نہیں کانپے'' فضیلہ نے اُسے کوستے ہوئے کہا۔

''میں نے کیا کیا ہے فضیلہ بہن'' اُس کے لہجے میں معصومیت بھری ہوئی تھی۔

''اتنی بھولی نہ بن ابھی ابھی مجھے ہسپتال سے فون آیا ہے کہ اُجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی......'' فضیلہ نے اُس کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو اس میں میرا کیا قصور ہے جو بھی کیا ہے تم نے خود ہی کیا ہے'' اُس نے فضیلہ پر الزام لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو تمھیں اُجالا کے بال دیتے وقت سختی سے منع کیا تھا کہ اُس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن تم نے ......میں تمھیں اس گھنونے کام کی سزا دلوا کر رہوں گی'' وہ بدستور اُس کی گردن دبوچے ہوئے تھی۔

''کیسی سزا اور کس کام کی سزا......'' اُس نے ایک دھکہ مارا اور فضیلہ دور جا گری۔ ''میں نے تمھیں پہلے ہی بتایا تھا کہ کالے جادو کی کوئی سزا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہوتا'' اس لیے مجھے سزا دلوانے کی تمھاری خواہش تو پوری نہیں ہو سکتی''۔

''میں محمود بھائی کو سب کچھ بتا دوں گی پھر دیکھنا وہ تمھارا کیا حال کرتے ہیں''۔

''بے وقوف عورت کیا بتاؤ گی اپنے بھائی کو کہ میں نے تمھاری بیٹی پر کالا جادو کروایا تھا......لیکن کالے جادو کے لیے مجھے اُس کے بال کس نے دیئے تھے......اُس کی اپنی بہن نے......اور جب وہ میری یہ بات سنے گا تو بالکل پاگل ہو جائے گا پھر میرا تو جو ہوگا وہ ہوگا لیکن تمھارا کیا حال ہوگا زرا وہ سوچو......''اُس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''لیکن تم نے ایسا کیوں کیا آخر اُس معصوم بچی نے تمھارا کیا بگاڑا تھا......؟''۔

''تو کیا میری بچی معصوم نہیں تھی جس کی دوائی کے لیے میں نے تمھاری بھابھی سے پیسے مانگیں تو اُس نے یہ کہہ کہ مجھے گھر سے نکال دیا کہ ان لوگوں کا تو روز روز کا ڈرامہ ہے......یہیں اسی جگہ میری چھوٹی سی بیٹی نے دوائی نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی، اُس نے روتے روتے اپنا حال بیان کیا۔''میں نے تو اسی دن سوچ لیا تھا کہ میں اُس سے بدلہ لے کر رہوں گی اسی لیے میں نے تمھاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا اور الزام تمھاری بھابھی پر لگا دیا اور پھر تم نے غصے میں آ کر بدلہ لینے میں میری مدد کی''اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم نے میری بیٹی کو......'' فضیلہ نے نسیم کو دھکا دیا اور پاس پڑا ہوا راڈ اُس کے سر پر دے مارا۔

نسیم درد سے کراہنے لگی اور فضیلہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

''پھوپھو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ اتنا گرا ہوا کام کر سکتی ہیں''اُس نے فضیلہ کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''مجھے میرے کیے کی سزا مل رہی ہے بیٹا میں تو زندہ ہی اس لیے تھی کہ تم سے معافی مانگ سکوں''۔

''آپ کو شرم نہیں آتی کہ اتنا گرا ہوا کام کرنے کے بعد معافی مانگ رہی ہیں، میں آپ کو اس دنیا میں تو کیا

حشر کے دن بھی معاف نہیں کروں گا'' اُس نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''بدلے کی آگ نے آپ کو اتنا اندھا کر دیا کہ آپ نے ایک چھوٹی سی بچی کو بھی نہیں بخشا'' ماہم کو بھی فضیلہ سے نفرت ہو رہی تھی۔

امی اگر آپ نے اُسے اپنی بھتیجی نہیں سمجھا تھا تو یہ تو سمجھ سکتی تھیں کہ وہ آپ کی بیٹی کی نند ہے، اب میں کیا منہ دکھاؤں گی گھر والوں کو آپ نے تو مجھے کسی سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا'' یہ اُس کے گناہوں کی سزا تھی کہ آج اُس کی اپنی بیٹی اُسے کوس رہی تھی۔

☆☆

''ارے یہ ساحر اور مائرہ کہاں رہ گئے ابھی تک آئے نہیں'' مسز محمود نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بابا میں اُن دونوں کو بلا کر لاتی ہوں'' ماہم اُن دونوں کو بلانے چلی گئی۔

''میں مائرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بہت ہی اچھی بچی ہے اپنی ماہ کی اس حرکت کی وجہ سے وہ ہمارا سامنا کرنے سے کترا رہی ہے'' محمود صاحب اپنی رائے بیان کرتے ہوئے کہا۔

''یقین نہیں آتا کہ فضیلہ اتنا بڑا گناہ کر سکتی ہے'' مسز محمود کو اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

''غصہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے پھر اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا''۔

''اتنا اندھا کر دیتا ہے کہ اُسے اپنے رشتوں کا بھی کوئی خیال نہیں رہتا'' مسز محمود میں کے لہجے میں غصے اور غم کے ملے جلے اثرات تھے۔

''اگر اُس نے رشتوں کا خیال نہیں کیا تو تم ہی کر لو اس وقت موت کے قریب ہے اُسے معاف کر دو ویسے بھی اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

''وہ جو سزا بھگت رہی ہے وہ اُسی کے لائق ہے میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گی''۔

''اچھا ابھی اپنا موڈ ٹھیک کرو بچے آ رہے ہیں'' محمود صاحب نے بچوں کو آتے دیکھ کر کہا۔

''السلام وعلیکم'' مائرہ اور ساحر نے سب کو سلام کیا۔

''کیا بات ہے...... آج تو بابا بھی ناشتے کی میز پر......'' اُسے محمود صاحب کو دیکھ کر خیرت ہوئی تھی۔

''ہاں بھائی آج میری بہو نے کھانا بنایا ہے تو میں بھی کھانے چلا آیا''۔

''مطلب کہ آج کھانا بھابھی نے بنایا ہے'' ساحر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا اس سے پہلے کہ سب کھانا شروع کریں مجھے آپ سب سے ایک ضروری بات کرنی ہے'' ماہم نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''ہاں بیٹا بولو کیا بات ہے'' محمود صاحب نے ماہم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''بابا میں جانتی ہوں کہ پھوپھو نے جو کچھ بھی کیا وہ غلط کیا لیکن......''۔

''ماہم میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گی'' فہد نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''فہد پلیز مجھے بات کرنے دو پھر جو تم کہو گے میں وہی کروں گی'' اُس نے درخواست کرنے والے لہجے میں کہا۔

''ایک بار سب سن لو کہ ماہم کیا کہنا چاہتی ہے اُس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تم لوگوں کو کیا کرنا ہے'' محمود صاحب نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بے شک میں نے اُجالا کو دیکھا نہیں لیکن میں بھی اُس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی آپ سب لوگ کرتے ہیں لندن میں ہر سال ہم اُس کی سالگرہ مناتے تھے، یقیناً کسی اپنے کو کھونے کا غم بہت بڑا ہوتا ہے میں دس سال کی تھی جب میں نے اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس

نہیں ہوئی اور دیکھ لیں آج اللہ تعالیٰ نے آپ سب کو میری زندگی میں شامل کر دیا'' سب بڑی غور سے اُس کی بات سن رہے تھے۔

''دیکھیں پھوپھو نے بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے لیکن اب وہ اُس گناہ کی سزا بھگت رہی ہیں اور اب اُن کے پاس بہت کم سانسیں بچی ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سب بھی پھوپھو کو اُجالا کا خون معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت جلد آپ کی اُجالا واپس لٹا دے گا میرے بچے کی صورت میں'' اُس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ماشاءاللہ...... کتنے دنوں بعد ہمارے گھر میں بھی کوئی خوشی آئی ہے میں اسی خوشی میں فضیلہ کو معاف کرتا ہوں'' محمود صاحب نے پہل کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی معاف کرتا ہوں'' ساحر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی''۔

''اگر تم بچوں کی یہی خوشی ہے تو میں بھی فضیلہ کو معاف کرتی ہوں''۔ مسز محمود نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اب سب کی نظریں فہد پر جمی ہوئی تھی۔

''فہد بھائی آپ بھی پلیز امی کو معاف کر دیں'' مائرہ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں بھی پھوپھو کو معاف کرتا ہوں'' فہد نے بھی بالآخر فضیلہ کو معاف کر دیا۔

''امی اتنی بڑی خوشخبری ملی ہے کوئی مٹھائی بھی کھانے کو ملے گی یا پھر صرف ناشتے سے ہی کام چلانا پڑے گا'' ساحر نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ کھانا شروع کرو میں مٹھائی لے کر آتی ہوں'' مسز محمود مٹھائی لینے چلی گئی اور باقی سب باتوں میں مصروف ہو گئے۔

آج سالوں بعد محمود ہاؤس میں خوشیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔



ہال میں ہر طرف خاموشی تھی، اسٹیج پر ایک طرف روشنی نمودار ہوئی اور آفتاب صدیقی جو کہ فیشن میگزینز کے سینیئر ہیڈ رہ چکے تھے مائیک پر سالانہ فوٹوگرافی کے مقابلے کی اناؤنسمنٹ کر رہے تھے جو کہ ایک مہینے بعد منعقد ہونے والا تھا یہ سنتے ہی ہال میں ہر طرف چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں ہر کوئی اس مقابلے کے لیے بہت پُرجوش نظر آرہا تھا مگر کوئی ایک ایسا تھا جو یہ سنتے ہی بالکل ہی ساکن ہوگیا وہ نہ تو خوشی کا اظہار کر رہا تھا نہ ہی پُرجوش دکھائی دیتا تھا بلکہ دم سادھے کھڑا وہ کوئی اور نہیں بلکہ زین حمادی تھا جو پچھلے پانچ سال سے یہ مقابلہ جیت رہا تھا جو انوکھے فوٹوگرافی سٹائل کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ وہ اس قسم کی فوٹوشوٹ کرتا کہ ہر سال ایوارڈ زین حمادی کے نام ہوتا نہ صرف پاکستان بلکہ انٹرنیشنل میگزینز بھی اُن فوٹوز کو فرنٹ پیج کی زینت بنانے کے لیے خریدتے اور فیشن ورلڈ میں زین حمادی ہی [illegible] اس

سے بھی زیادہ اس مقابلے کو لے کر سنجیدہ تھا کیونکہ آج بھی وہ جیتنے کی روایت کو قائم رکھنا چاہتا تھا وہ ہر دفعہ کی طرح آج بھی کچھ نیا کر کے خود کو منوانا چاہتا تھا اب وہیں اُسے بہت سے لوگ بیسٹ وشز دے رہے تھے ساتھ ہی ساتھ میڈیا والے بھی طرح طرح کے سوال کر رہے تھے مگر اُس کا دماغ ابھی سے اُس مقابلے کی تیاری میں ڈٹ گیا تھا وہ اپنے کام کے معاملے میں بالکل جنونی تھا اور وہ اس کے لیے کسی بھی حد سے گزر جانا جانتا تھا مگر اب وہ نہیں جانتا تھا کہ اب وہ ایسا کونسا چہرہ سامنے لانا چاہتا تھا کیونکہ زین حمادی کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ایسے چہرے شوٹ کرتا جو نہ اس سے پہلے کسی نے دیکھے ہوتے اور نہ ہی اس کے شوٹ کے بعد وہ کسی کو نظر آتے اور اس کی یہی خوبی اسے سب سے منفرد بناتی تھی۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے نکل کر خود کو تنہا کر لینا چاہتا تھا کچھ دیر میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ الحمرا ہال سے باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگانے لگا اب اُس کا دماغ بہت سی سوچوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر چہرہ ذہن میں آتے ہی ریجیکٹ ہوتا جا رہا تھا اب کی بار بھی اسے خود کو منوانے کے لیے کچھ الگ کرنا تھا اب اس نے ایک گہری لمبی سانس لی اور گاڑی کو سٹارٹ کیا مگر دماغ میں اب بھی اک ہلچل مچی ہوئی تھی ترغیبوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا مگر زین کو کچھ نیا کرنا تھا اب وہ بے ترتیب گاڑی لاہور کی سڑکوں پر گھمانے لگا اور ایک کے بعد اک سگریٹ لگا تا جا رہا تھا وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اُسے جانا کہاں ہے اور اُسے کس کی تلاش ہے وہ تو بس اپنے جنون میں ڈوبا گاڑی دوڑا رہا تھا۔

☆......☆......☆

گاڑی ایک تاریک سڑک پر سگنل پر رُکی تو زین حماد کی نظر کچھ عورتوں پر پڑی جو ہر گاڑی کی جانب بڑھتیں اور ایک خاص انداز میں کچھ پوچھتیں اگر کسی کو پسند آ جاتیں تو لوگ انہیں ساتھ بٹھا کر لے جاتے زین حمادی سمجھ گیا کہ وہ طوائف ہیں اُس نے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھا اور نظر پھیر لی لیکن اُسے کچھ ایسا نظر آیا کے وہ اُسی جانب دوبارہ دیکھنے پر مجبور ہو گیا اب کی بار اُس نے نایٹ گلاسز اُتار کر اُس لڑکی کو دیکھا جو اُنہی عورتوں میں ایسے

کھڑی تھی جیسے اُسے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو کہ کوئی اُسے اپنے ساتھ لے جائے اور نہ ہی وہ گاڑیوں کی طرف لپک رہی تھی اب زین حمادی اُس خاموش لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا اُس نے اشارہ کیا تو بہت سی عورتیں گاڑی کی جانب آ گئیں اور بے ہودہ قسم کے فقرے کسنے لگیں مگر زین حمادی نے اُس لڑکی کو بلایا تو وہ آہستہ سے گاڑی کے قریب آ گئی اب باقی عورتیں اُس لڑکی کو چھیڑ رہی تھیں پہلے تو زین حمادی کو بہت غصہ آیا پھر وہ قابو پا کر اُس لڑکی سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ لگاتار ایک ہفتہ اُس کے ساتھ کام کرے گی پہلے تو لڑکی نے کہا کہ وہ روز دھندے پر نہیں جاتی مگر جب زین حمادی نے اُسے کہا کے ایک رات کا دس ہزار دیا جائے گا تو لڑکی بے یقینی سے دیکھنے لگی پھر ہاں کر دی زین حمادی نے گاڑی کھول دی اور اُسے گاڑی میں بٹھا کر اُس کا مکمل پتہ اور نمبر لے لیا اور بتایا کہ کل رات ۱۲ بجے اُس کا ڈرائیور گھر سے لے آئے گا اور اُسے گاڑی سے اُترنے کا کہہ دیا اب وہ لڑکی گاڑی سے اُتر چکی تھی اور زین حمادی نے گاڑی پھر مکمل رفتار سے آگے کی جانب بڑھا دی مگر اب اُسے وہ بے چینی نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے تھی اب وہ اُس چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا، اور اب وہ اپنے اسسٹنٹ کو فون پر ہدایات دے رہا تھا کہ کل اُسے کیا کیا کرنا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز رات گیارہ بجے ایک شاندار گاڑی طوائف محلے میں داخل ہوئی اب ہر کسی کی نظر اُس گاڑی پر تھی یوں تو ایسی شاندار کئی گاڑیاں اُس محلے میں آتیں تھیں مگر ماہ پارہ کے کوٹھے کے سامنے ایسی گاڑی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اُسے ایک تو ایڈز کی بیماری تھی دوسرا وہ کچھ زیادہ شوخ بھی نہ تھی تھوڑی ہی دیر بعد ماہ پارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اب اُس محلے میں ماہ پارہ کا اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر جانا بہت عجیب تھا تو سب لوگ ماہپارہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اُس محلے سے نکلتے ہوئے ماہپارہ نے اردگرد کا جائزہ لیا تو اُسے محسوس ہوا کہ بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھ کر دنیا اور بھی خوبصورت لگتی ہے اب وہ خود پر فخر کر رہی تھی اور خود کو دِل ہی دِل میں داد دے

رہی تھی مگر بہت سے سوالوں نے دماغ کو گھیرا ہوا تھا جن کے جواب ڈھونڈنا اُس کے لیے تو ناممکن تھا اب گاڑی اُس محلے سے نکل کر مین روڈ پر آ چکی تھی اب وہ اپنے اطراف گاڑیاں دیکھ رہی تھی جب گاڑی سگنل پر رُکی تو اُس کی نظر اُس کونے پر پڑی جہاں وہ بہت سی لڑکیوں کے درمیان کھڑی ہو کر اپنی عزت کے سوداگر کا انتظار کرتی ہے وہ جگہ بھی اب اُسے حقیر سی لگی تھی شاید اُسے یہ زرا سی اہمیت ملنے کا خمار تھا جو آج اُسے اُس کا سالوں پرانا پیشہ ہی کمتر لگنے لگا تھا کچھ دیر میں گاڑی جو ہر ٹاؤن کے ایک گنجان علاقے میں داخل ہوئی اب وہ بڑی بڑی کوٹھیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کچھ دیر بعد گاڑی ایک عالیشان گھر میں داخل ہوئی اب ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا، ماہپارہ زرا مزید تن کر گاڑی سے اُتری اُسے زین حمادی کے اسسٹنٹ نے ریسو کیا اور اپنے ساتھ سیکنڈ فلور پر لے گیا جہاں زین حمادی کا پرسنل اسٹوڈیو تھا، ماہپارہ سب کچھ بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی جہاں اُس کے لیے لوگ بھی نئے تھے اور جگہ بھی ایسی کہ اُس نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی وہ سر گھماتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور نگاہیں اُس شخص کی منتظر تھیں جسے اُس نے یہاں بلایا تھا وہیں گزرتے ہوئے ماہپارہ کی نظر اُس پر پڑی جس کے چہرے سے تو کچھ شناسائی تھی مگر نام اب بھی نہیں پتہ تھا ساتھ چلتے ہوئے آدمی نے ماہپارہ کو ایک روم میں بیٹھنے کو کہا اور خود چلا گیا اب ماہپارہ گھبرائی ہوئی گلاس ڈور سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اِس جگہ کیسے کام کے لیے بلائی گئی تھی یا ایسا کیا کام کروانے کے لیے اُسے بلایا گیا تھا جس کی اتنی بڑی رقم اُسے دینے کی بات کی گئی تھی اب بھی وہ خود سے اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈتے ہوئے خود سے الجھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑی دیر بعد زین حمادی ایک میک اپ اسٹائلسٹ شینا اور دو آدمیوں کے ساتھ اُسی کمرے میں داخل ہوا جہاں ماہپارہ کو بٹھایا گیا تھا زین کے داخل ہوتے ہی ماہپارہ نے سر اُٹھایا اور بہت عجیب سی نظروں سے زین کے ساتھ دونوں مردوں اور اُس عورت کو دیکھا، اب زین حمادی ماہپارہ کی بے چینی سمجھ چکا تھا وہ اب ماہپارہ کے قریب

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُسے سمجھانے والے انداز میں بتا رہا تھا کہ میں تمھیں مختلف کپڑے پہنا کر تمھاری تصویریں لوں گا اور اسی کے لیے تمھیں پیسے دیے جائیں گے اب وہ پاس کھڑی شینا کو ہدایات دے رہا تھا اور یکدم ماہپارہ کی طرف پلٹ کر نام پوچھنے لگا، ماہپارہ نے دبی سی آواز میں نام بتایا اور وہ پھر سے اُن تینوں کے ساتھ مصروف ہوگیا، ہدایات دیتے ہی وہ کمرے سے چلا گیا اب شینا ماہپارہ کو اپنے ساتھ لے کر میک اپ روم چلی گئی وہیں اُسے پہنن کے لیے ایک لمبی چادر نُما لباس دیا گیا اب ماہپارہ شرماتے ہوئے اُسے پہننے کا پوچھ رہی تھی وہ پہنا کر اب شینا نے اُسے میک اوور سے ڈفرنٹ لُک دی اور اُسے ایک ہال میں لے گئی جہاں پہلے سے ہی زین حمادی اور ایک لائٹ مین موجود تھا زین نے ماہپارہ کو مخاطب کر کے جب تعریف کی تو ماہپارہ کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں لیکن فوراً ہی زین نے ماہپارہ کو ایک مخصوص پوز میں کھڑا ہونے کو کہا اور کچھ شوٹس لیے گئے پھر ایک کُرسی پر بٹھا کر کچھ پوز بنا کر تصویریں بنائی گئیں اور زین حمادی اب وہاں سے تیزی سے نکل گیا اب شینا اُس کی جیولری اور ڈریس بدلوا رہی تھی کچھ دیر میں شینا نے اُسے دس ہزار تھما دیے اور گاڑی اُسے واپس چھوڑنے چلی گئی۔

☆......☆......☆

گاڑی میں بیٹھی ماہپارہ اب اپنے ہوش و حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا وہ اِس قدر اہم تھی کہ اُسے اتنا بڑا آدمی صرف چند تصاویر کا دس ہزار دینے کو تیار تھا اب اس نے ذرا مزید فخر سے اپنے شانے تن لیے، اب وہ سوچ رہی تھی کہ جا کر اپنی سہیلی جہاں آرا کو بھی بتائے گی کہ وہ اصل میں کتنی حسین ہے کہ اب لوگ اس کے لیے اپنی شاندار گاڑی بھیجتے ہیں وہ اب ہاتھ میں پکڑی رقم بار بار گن رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے حُسن کو داد دے رہی تھی کچھ ہی دیر میں گاڑی اُسی محلے میں داخل ہوئی اس نے اپنے اِرد گرد کا جائزہ لیا جہاں بہت سے لوگوں کی نظر اسی گاڑی پر تھی ماہپارہ کو گھر اُتار کر ڈرائیور واپس چلا گیا اب اس کے اطراف ماہپارہ کے

قریب آ گیا اور بڑے ہی تجسس بھرے لہجے میں بولا' اے پاری تیرے بڑے ٹھاٹھ باٹھ ہیں آجکلل لگتا دن پھر گئے تیرے بھی کوئی بڑا اُمرغا قابو کیا ہے' اب وہ خباثت سی ہنسی ہنس رہا تھا اُسن ٹپو اپنے کام سے کام رکھا کر میں نے کبھی تیرے دھندے کی کوئی بات کی ہے جو تجھے میرے دھندے کی فکر کھا رہی ہے ماہپارہ زرا غُرا کر بولی اور تیزی سے گھر چلی گئی اندر داخل ہوتے ہی دیکھتی ہے کہ بہت سے لوگ گھر میں موجود تھے جو سب حیرانی سے ماہپارہ سے بہت سے سوال کرر ہے تھے یہ دیکھ کر ماہپارہ کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہ رہا اب وہ زرا فخریہ انداز میں سب کو بتانے لگی کہ اب سے وہ ہیروئین بن گئی ہے اور اب وہ یہ دھندا چھوڑ دے گی ساتھ ہی اپنی بیماری کا علاج بھی کروائے گی سب ماہپارہ کی قسمت پر رشک کرر ہے تھے اور کچھ لڑکیاں تو اب ماہپارہ کو کام کے لیے درخواست کر رہیں تھیں تو ماہپارہ جھنجلا کر بولی کہ میں پہلے ہی بہت تھک گئی ہوں تو اب جاؤ آرام کرنے دو پہلے ہی دن ماہپارہ کے رنگ ڈھنگ بدلے بدلے لگ رہے تھے غرور اُس کی ہر ادا سے چھلک رہا تھا اب سب واہ واہ کرتے ہوئے ماہپارہ کے گھر سے نکل رہے تھے اور ماہپارہ مزید اترانے لگی تھی یونہی خود پر ناز کرتے کرتے وہ نہ جانے کب گہری نیند کے سحر میں جا پہنچی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح زین حمادی ٹیبل پر بکھری رات کی ماہپارہ کی فوٹوز کو بار بار دیکھ رہا تھا اور لمحہ بالمحہ تعریفی جملے ادا کر رہا تھا ہر تصویر ایک الگ ہی شاہکار لگتی تھی کہیں اُس کی لمبی پلکوں نے آنکھوں کو ڈھک دیا تھا تو کہیں گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لبوں نے شرماہٹ کو ایک اور ہی رنگ دیا تھا زین حمادی ہر طرح سے پُراعتماد نظر آ رہا تھا کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ جیت کا جشن اپنے نام کر لے گا جیت اُس کی محض عادت ہی نہیں نشہ بھی تھی اور اس نشے کے لیے وہ کسی بھی حد سے گزر جاتا تھا صحیح یا غلط کا فرق اُس کے لیے بےمعنی ہو جاتا تھا تصاویر کو بار بار دیکھنے کے بعد آخر میں ٹیبل پر ایک طرف کرتے ہوئے اب وہ شینا کو ہدایات دے رہا تھا اور ساتھ ہی بیک گراؤنڈ کے متعلق

بھی بتا رہا تھا ساتھ ہی شینا اب زین حمادی سے ماہپارہ کو نیو اسٹائل دینے کے بارے میں بات کر رہی تھی، ادھر ماہپارہ سو کر اُٹھی تو منہ دھوتے ہی جہاں آرا کی طرف چلی گئی اب اُسے بڑھ چڑھ کر پچھلی رات کا قصہ سُنا رہی تھی ، دیکھا تو کہتی تھی نا کہ بیماری کو کون اپنے ساتھ لے جائے گا اب دیکھ میں کتنے کام کی ہوں ماہپارہ زرا خفگی سے بول رہی تھی ، اچھا چل یہ بتا میرے لیے بھی کوئی کام ہوگا ادھر ، دیکھ تیری سب سے قریبی سہیلی ہوں جہاں آرا اس کی بات ان سُنی کر کے اپنا اصل مُدعا پیش کر رہی تھی اچھا دیکھوں گی ماہپارہ زرا اکڑتے ہوئے بول کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆......☆

رات کے ۱۱ بج رہے تھے گاڑی دروازے پر آ پہنچی تھی ماہپارہ اِتراتے ہوئے بیٹھ گئی آج بھی سب لوگ ماہپارہ کو حسرت سے دیکھ رہے تھے سب اُس کی قسمت پر ناز کر رہے تھے آج وہ کل سے زیادہ پُر اعتماد تھی اسٹوڈیو پہنچتے ہی وہ خود اوپر چلی گئی آج وہ شینا سے حال بھی دریافت کر رہی تھی کچھ ہی دیر میں جب زین حمادی وہاں آیا تو وہ زرا نخرے دکھانے لگی ساتھ ہی ساتھ زین حمادی کو ظاہر کروا رہی تھی کہ وہ بیمار ہے لیکن پھر بھی اُس کے لیے کام پر آئی ہے وہ جب شُوٹ دے رہی تھی تو جان بوجھ کر بار بار زین حمادی کے قریب آ جاتی اور اُسے بتاتی کہ وہ بہت تھک گئی ہے لیکن زین حمادی پوری طرح سے اپنے کام پر فوکس کر رہا تھا اس کے لیے ماہپارہ کے نخرے یا تھکن بے معنی تھی دو گھنٹے میں اس نے شوٹنگ مکمل کی جب وہ اسٹوڈیو سے جانے لگا تو ماہپارہ زرا خفگی سے زین حمادی کو روک کر بتانے لگی کہ وہ ایڈز کی مریضہ ہے تا کہ زین حمادی کو اس پر ترس آ سکے اور وہ اس کی توجہ حاصل کر سکے مگر زین حمادی پر بالکل فرق نہیں پڑا وہ چپ چاپ اسٹوڈیو سے چلا گیا شینا نے اُسے دس ہزار تھمایا تو ماہپارہ غصے سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی اب اسے شدید غصہ آ رہا تھا کہ زین حمادی کو بلکل بھی اثر نہیں ہوا تھا وہ اپنی بے چارگی پر رونا چاہتی تھی مگر خود [illegible] کر بیٹھی [illegible]

☆......☆......☆

اگلے دن جب ماہپارہ کو گاڑی لینے پہنچی تو اس نے جانے سے انکار کر دیا کہ وہ بہت بیمار ہے کام نہیں کر سکتی جب واپس جا کر ڈرائیور نے بتایا تو زین حمادی کو شدید غصہ آیا اس نے دل میں سوچا ایسے لوگوں کو ذرا سی عزت کیا دو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں غصے سے چابی لے کر ماہپارہ کے گھر چلا گیا اُس کے گھر پہنچا تو ماہپارہ کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا وہ باچھیں کھلائے آکر زین حمادی کے ساتھ بیٹھ گئی اب زین حمادی غصے میں بڑبڑا رہا تھا مگر اب وہ کسی بھی قسم کا رِسک نہیں لینا چاہتا تھا اور نہ زین حمادی تو وہ تھا جس سے بڑی بڑی ماڈلز مہینوں پہلے اپوائمنٹ لیتی تھیں لیکن اس وقت تو ماہپارہ بھی زین حمادی کی جیت کا آسان اور واحد رستہ تھی یہی وجہ تھی جو وہ اس کے گھر تک جا پہنچا تھا مگر اب اس نے سوچ لیا کہ وہ کام جلد سے جلد ختم کرے گا اور پھر سے اس کی شکل کبھی نہیں دیکھے گا ،وہیں ماہپارہ سمجھ رہی تھی کہ زین حمادی جیسے انسان کو اُس سے لگاؤ ہونے لگا تھا وہ بہت خوش تھی اور دِل و جان نچھاور کرنے کو تیار تھی کچھ دیر میں وہ اسٹوڈیو پہنچ گئے زین حمادی نے ٹھان لی تھی کہ وہ آج ہی کام ختم کر لے گا اُس نے ماہپارہ کہ نہایت دھیمے لہجے میں کہا کہ آج ہم ساری رات کام کریں گے اور میں تمھیں پچیس ہزار دوں گا ماہپارا کی تو خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا وہ تو ویسے بھی زین حمادی کی قربت میں رہنا چاہتی تھی زین حمادی نے رات میں ہی مختلف بیک گراؤنڈ اور کاسٹیومز میں بہت سے منفرد پوزز میں شوٹ لیے سورج طلوع ہو رہا تھا کام مکمل ہو چکا تھا شینا نے پچیس ہزار ماہپارہ کو تھما دیے اور بتا دیا کہ کام مکمل ہو گیا ہے کل سے اُسے آنے کی ضرورت نہیں یہ سنتے ہی ماہپارہ کا چہرا اُتر گیا اب وہ رو دینے کو تھی جاتے ہوئے زین حمادی نے اُسے ایک کارڈ دیا جو کسی ڈاکٹر کا تھا جو اُس کا مفت علاج کر سکتا تھا مگر ماہپارہ تو زین حمادی کے پاس رہنا چاہتی تھی کچھ دیر میں ڈرائیور اُسے لے کر چلا گیا زین حمادی اب اپنا تمام وقت اِن تصاویر کو سیٹ کرنے میں لگانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

ماہپارہ نے اب دھندے پر جانا چھوڑ دیا تھا وہ گھر رہنے لگی تھی دِن گزرتے جا رہے تھے اور اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی یوں تو اُس کا پیشہ اس قسم کا تھا کہ وہ بہت سے مردوں سے مِل چکی تھی مگر پلٹ کر اُس نے کبھی کسی کو یاد نہیں کیا تھا مگر زین حمادی کو وہ شدت سے یاد کرنے لگی تھی اور بہت بار وہ اس سے ملنے کا ارادہ کر چکی تھی مگر جانے کی ہمت نہیں تھی اب علاج کے لیے رقم بھی ختم ہو چکی تھی تو اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ زین حمادی پاس جائے گی اور مدد مانگے گی کیونکہ اُسے زین حمادی سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں اگلے ہی دن وہ زین حمادی کے اسٹوڈیو جا پہنچی جہاں اس نے واچ مین کو کہا کہ اُس کا نام ماہپارہ ہے اور اسے زین حمادی سے ملنا ہے واچ مین نے کچھ دیر بعد آ کر بتایا کہ زین صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی ماہپارہ کو نہیں جانتے ماہپارہ وہیں ساکن رہ گئی اسے جیسے یقین ہی نہ آیا ہو کچھ ہی دنوں میں ویسے بھی ماہپارہ کی حالت کافی بگڑ چکی تھی اور اب تو اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی تو اپنے قدموں پر چلنا ہی اُس کے لیے عذاب جیسا تھا وہ خود کو روندتے ہوئے گھر تک پہنچ چکی تھی آس پاس کے لوگ بھی اب اُس پر ہنسنے لگے تھے اُسے کبھی خود سے نفرت نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہو رہی تھی اُس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا وہ اپنے جسم کو نوچتی خود کو کوستی رہتی کہ مدد کے لیے کس کو پکارے۔

☆......☆......☆

دوسری طرف زین حمادی مقابلے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا ایک دِن باقی تھا اور وہ بہت پُر جوش تھا اُسے مکمل یقین تھا کہ اِس بار بھی وہی جیتے گا اور انٹرنیشنل میگزینز ان تصاویر کو ضرور خریدیں گے یہ تصاویر ہر مشہور میگزین کے فرنٹ پیج کی زینت ہونگی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماہپارہ کا چہرہ منفرد اِس لیے بھی تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی کسی کو نظر نہیں آئے گا اور لوگ کئی مہینوں تک اِس چہرے کی تلاش میں رہیں گے،

ماہپارہ کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی وہ جانتی تھی کہ اب اُس کے پاس مہلت بہت کم ہے لیکن وہ آخری بار زین حمادی سے ملنا چاہتی تھی اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ کل جائے گی اور لازم مِل کر آئے گی، کچھ لوگ زندگی میں ایسے

آتے ہیں جو اپنا اثر ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتے ہیں اور اثر بھی اتنا گہرا کہ وہ مرنے کے بعد ہی مٹتا ہے زین حمادی بھی ماہپارہ کی زندگی میں ایسا ہی تھا جو اتنا گہرا اثر چھوڑ گیا تھا کہ وہ آخری لمحات میں بھی اُس سے ملنے کی خواہشمند تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح دس بجے ماہپارہ زین حمادی کے اسٹوڈیو پہنچ گئی، مین گیٹ پر واچ مین نے دیکھتے ہی روک لیا ماہپارہ کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اُسے ماہپارہ پر بہت ترس آیا وہ ماہپارہ کو پہلے بھی گاڑی میں آتے جاتے دیکھ چکا تھا اور اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ زین حمادی جیسا آدمی صرف لوگوں کو استعمال کرنا جانتا تھا احساسات اس کے لیے کچھ معنی نہ رکھتے تھے اب واچ مین ماہپارہ سے دریافت کر رہا تھا کہ ایسا کیا کام ہے جو وہ اتنی بُری حالت میں بار بار آتی ہے ماہپارہ کی آنکھوں سے بے ضبط آنسو بہتے جا رہے تھے اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اس نے ہاتھ جوڑ لیے اور مزید رونے لگی اور روتے روتے کہہ رہی تھی میرے پاس شاید وقت بہت کم ہے مگر مجھے زین حمادی سے ایک دفعہ ملنا ہے اسے چاہے میری آخری خواہش سمجھ لو اب وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی واچ مین نے ذرا ڈرتے ہوئے کہا کہ دیکھیں مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں بتاؤں کہ صاحب کہاں گئے ہیں مگر تمھاری حالت پر مجھ ترس آ رہا ہے اس لیے بتا رہا ہوں کہ زین حمادی صاحب الحمراء ہال گئے ہیں جاؤ اُن سے مل لو، ماہپارہ اب ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کر رہی تھی اور وہاں سے اُٹھ کر پاگلوں کی طرح ہال کی طرف بھاگنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ہال کے قریب پہنچی تو اُس کی نظر بہت سے لوگوں پر پڑی وہاں ایک بڑا ہجوم تھا بہت سے ایکٹرز مختلف ٹی وی چینلز کو انٹرویو دے رہے تھے اچانک اُس کی نظر زین حمادی پر پڑی جو کافی لوگوں کے درمیان کھڑا خوش گپیوں

میں مصروف تھا ماہپارہ نے دیکھتے ہی آگے بڑھنا چاہا مگر اُسے باہر ہی روک لیا گیا وہ وہیں چیختی رہی آوازیں دیتی رہی مگر بہت رش کی وجہ سے زین حمادی کو اُس کی آواز سُنائی نہیں دی کچھ ہی دیر میں سب ہال کے اندر جانے لگے مختلف فوٹوگرافرز نے فیشن فوٹوشوٹس دکھائے مگر زین حمادی کے فوٹوشوٹس دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح ہال میں ہر طرف تالیاں گونجنے لگیں ہر کوئی زین حمادی کی قابلیت کی داد دے رہا تھا کچھ دیر میں وِنر آف دی ییر زین حمادی کو ایوارڈ دیا گیا ہر میگزین چاہتا تھا کہ وہ یہ تصاویر خرید لے مگر جس کی تصاویر سے زین حمادی جیت گیا تھا وہی باہر اپنی زندگی کی بازی ہار رہی تھی ہال میں بیٹھا ہر شخص اُس کے حسن کو داد دے رہا تھا پوچھ رہا تھا کہ یہ کون ہے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر دم توڑ گئی کچھ دیر میں اندر بڑے بڑے ورلڈ میگزینز آنرز اُس کی تصاویر کی بولی لگا رہے تھے اور باہر وہ لاوارث پڑی تھی اچانک باہر سے بھاگتا ہوا ایک انٹرنیشنل فیشن کمپنی کا ورکر اندر آیا اور آ کر اپنے باس کو بتایا کہ جس کی یہ تصاویر ہیں وہ لڑکی باہر پڑی ہے اور ارد گرد لوگ جمع ہیں شاید کوئی حادثاتی موت ہے وہ تیزی سے بولتا جا رہا تھا سانس لینے کو رُکا ہی تھا کہ اُس کے باس نے اُسے بُری طرح ٹوک دیا کہ ہمیں اُس لڑکی سے کوئی مطلب نہیں شاہکار تو یہ تصویریں ہیں جنہیں زین حمادی نے زینت بخشی وہ ورکر یہ سُن کر بُری طرح مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور پیچھے کھڑا یہی سوچ رہا تھا اس رنگین دنیا میں انسان بالکل بے معنی ہے اُس کی نہ ہی کوئی قیمت ہے نہ ہی کوئی قدر، قدر ہے تو صرف اُس کاروبار کی جو کبھی تو جسموں کی نمائش سے کیا جاتا ہے اور کبھی اُن پر موجود مہنگے اور بے ڈھنگے کپڑوں سے، یہاں جو بے حس ہے وہی اس طلسمی دنیا کا سلطان ہے اور ڈھلتے سورج کی طرح ڈوبتے ہوئے وہ چہرے کوئی نہیں دیکھنا چاہتا جنہیں یا تو اس دنیا کے درندوں نے استعمال کیا یا وہ اس کی بناوٹی چمک سے دھوکا کھا گئے، اُس کی آنکھوں میں باہر پڑی ماہپارہ کی تصویر آ رہی تھی جو باہر لاوارث پڑی تھی جس کی کوئی پہچان نہیں تھی اور اندر اُسی ماہپارہ کی تصاویر جس کی بولی سرِ عام لگ رہی تھی اور اُس کی پہچان تھی زین حمادی۔

ماہپارہ نے اب دھندے پر جانا چھوڑ دیا تھا وہ گھر رہنے لگی تھی دِن گزرتے جا رہے تھے اور اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی یوں تو اُس کا پیشہ اس قسم کا تھا کہ وہ بہت سے مردوں سے مِل چکی تھی مگر پلٹ کر اُس نے کبھی کسی کو یاد نہیں کیا تھا مگر زین حمادی کو وہ شدت سے یاد کرنے لگی تھی اور بہت بار وہ اس سے ملنے کا ارادہ کر چکی تھی مگر جانے کی ہمت نہیں تھی اب علاج کے لیے رقم بھی ختم ہو چکی تھی تو اس نے ارادہ کر لیا تھا ک وہ زین حمادی پاس جائے گی اور مدد مانگے گی کیونکہ اُسے زین حمادی سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں اگلے ہی دن وہ زین حمادی کے اسٹوڈیو جا پہنچی جہاں اس نے واچ مین کو کہا کہ اُس کا نام ماہپارہ ہے اور اسے زین حمادی سے ملنا ہے واچ مین نے کچھ دیر بعد آ کر بتایا کہ زین صاحب کہ رہے ہیں کہ وہ کسی ماہپارہ کو نہیں جانتے ماہپارہ وہیں ساکن رہ گئی اسے جیسے یقین ہی نہ آیا ہو کچھ ہی دنوں میں ویسے بھی ماہپارہ کی حالت کافی بگڑ چکی تھی اور اب تو اُس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تھی تو اپنے قدموں پر چلنا ہی اُس کے لیے عذاب جیسا تھا وہ خود کو روندتے ہوئے گھر تک پہنچ چکی تھی آس پاس کے لوگ بھی اب اُس پر ہنسنے لگے تھے اُسے کبھی خود سے نفرت نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہو رہی تھی اُس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا وہ اپنے جسم کو نوچتی خود کو کوستی رہتی کہ مدد کے لیے کس کو پکارے۔

☆......☆......☆

دوسری طرف زین حمادی مقابلے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا ایک دِن باقی تھا اور وہ بہت پُر جوش تھا اُسے مکمل یقین تھا کہ اِس بار بھی وہی جیتے گا اور انٹرنیشنل میگزینز ان تصاویر کو ضرور خریدیں گے یہ تصاویر ہر مشہور میگزین کے فرنٹ پیج کی زینت ہونگی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماہپارہ کا چہرہ منفرد اِس لیے بھی تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی کسی کو نظر نہیں آئے گا اور لوگ کئی مہینوں تک اِس چہرے کی تلاش میں رہیں گے،

ماہپارہ کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی وہ جانتی تھی کہ اب اُس کے پاس مہلت بہت کم ہے لیکن وہ آخری بار زین حمادی سے ملنا چاہتی تھی اُس نے ارادہ کر لیا ک وہ کل جائے گی اور لازم مل کر آئے گی، کچھ لوگ زندگی میں ایسے

آتے ہیں جو اپنا اثر ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتے ہیں اور اثر بھی اتنا گہرا کہ وہ مرنے کے بعد ہی مٹتا ہے زین حمادی بھی ماہپارہ کی زندگی میں ایسا ہی تھا جو اتنا گہرا اثر چھوڑ گیا تھا کہ وہ آخری لمحات میں بھی اُس سے ملنے کی خواہشمند تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح دس بجے ماہپارہ زین حمادی کے اسٹوڈیو پہنچ گئی، مین گیٹ پر واچ مین نے دیکھتے ہی روک لیا ماہپارہ کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اُسے ماہپارہ پر بہت ترس آیا وہ ماہپارہ کو پہلے بھی گاڑی میں آتے جاتے دیکھ چکا تھا اور اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ زین حمادی جیسا آدمی صرف لوگوں کو استعمال کرنا جانتا تھا احساسات اس کے لیے کچھ معنی نہ رکھتے تھے اب واچ مین ماہپارہ سے دریافت کر رہا تھا کہ ایسا کیا کام ہے جو وہ اتنی بُری حالت میں بار بار آتی ہے ماہپارہ کی آنکھوں سے بے ضبط آنسو بہتے جا رہے تھے اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اس نے ہاتھ جوڑ لیے اور مزید رونے لگی اور روتے روتے کہہ رہی تھی میرے پاس شاید وقت بہت کم ہے مگر مجھے زین حمادی سے ایک دفعہ ملنا ہے اسے چاہے میری آخری خواہش سمجھ لو اب وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی واچ مین نے ذرا ڈرتے ہوئے کہا کہ دیکھیں مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں بتاؤں کہ صاحب کہاں گئے ہیں مگر تمھاری حالت پر مجھ ترس آ رہا ہے اس لیے بتا رہا ہوں کہ زین حمادی صاحب الحمراء ہال گئے ہیں جاؤ اُن سے مل لو، ماہپارہ اب ہاتھ جوڑ کر شکریہ ادا کر رہی تھی اور وہاں سے اُٹھ کر پاگلوں کی طرح ہال کی طرف بھاگنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ہال کے قریب پہنچی تو اُس کی نظر بہت سے لوگوں پر پڑی وہاں ایک بڑا ہجوم تھا بہت سے ایکٹرز مختلف ٹی وی چینلز کو انٹرویو دے رہے تھے اچانک اُس کی نظر زین حمادی پر پڑی جو کافی لوگوں کے درمیان کھڑا خوش گپیوں

میں مصروف تھا ماہپارہ نے دیکھتے ہی آگے بڑھنا چاہا مگر اُسے باہر ہی روک لیا گیا وہ وہیں چیختی رہی آوازیں دیتی رہی مگر بہت رش کی وجہ سے زین حمادی کو اُس کی آواز سُنائی نہیں دی کچھ ہی دیر میں سب ہال کے اندر جانے لگے مختلف فوٹوگرافرز نے فیشن فوٹوشوٹس دکھائے مگر زین حمادی کے فوٹوشوٹس دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح ہال میں ہر طرف تالیاں گونجنے لگیں ہر کوئی زین حمادی کی قابلیت کی داد دے رہا تھا کچھ دیر میں وزِآف دی ییر زین حمادی کو ایوارڈ دیا گیا ہر میگزین چاہتا تھا کہ وہ یہ تصاویر خرید لے مگر جس کی تصاویر سے زین حمادی جیت گیا تھا وہی باہر اپنی زندگی کی بازی ہار رہی تھی ہال میں بیٹھا ہر شخص اُس کے حسن کو داد دے رہا تھا پوچھ رہا تھا کہ یہ کون ہے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر دم توڑ گئی کچھ دیر میں اندر بڑے بڑے ورلڈ میگزینز آنرز اُس کی تصاویر کی بولی لگا رہے تھے اور باہر وہ لاوارث پڑی تھی اچانک باہر سے بھاگتا ہوا ایک انٹرنیشنل فیشن کمپنی کا ورکر اندر آیا اور آکر اپنے باس کو بتایا کہ جس کی یہ تصاویر ہیں وہ لڑکی باہر پڑی ہے اور ارد گرد لوگ جمع ہیں شاید کوئی حادثاتی موت ہے وہ تیزی سے بولتا جا رہا تھا سانس لینے کو رُکا ہی تھا کہ اُس کے باس نے اُسے بُری طرح ٹوک دیا کہ ہمیں اُس لڑکی سے کوئی مطلب نہیں شاہکار تو یہ تصویریں ہیں جنہیں زین حمادی نے زینت بخشی وہ ورکر یہ سُن کر بُری طرح مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور پیچھے کھڑا یہی سوچ رہا تھا اس رنگین دنیا میں انسان بالکل بے معنی ہے اُس کی نہ ہی کوئی قیمت ہے نہ ہی کوئی قدر، قدر ہے تو صرف اُس کاروبار کی جو کبھی تو جسموں کی نمائش سے کیا جاتا ہے اور کبھی اُن پر موجود مہنگے اور بے ڈھنگے کپڑوں سے، یہاں جو بے حس ہے وہی اس طلسمی دنیا کا سلطان ہے اور ڈھلتے سورج کی طرح ڈوبتے ہوئے وہ چہرے کوئی نہیں دیکھنا چاہتا جنہیں یا تو اس دنیا کے درندوں نے استعمال کیا یا وہ اس کی بناوٹی چمک سے دھوکا کھا گئے، اُس کی آنکھوں میں باہر پڑی ماہپارہ کی تصویر آ رہی تھی جو باہر لاوارث پڑی تھی جس کی کوئی پہچان نہیں تھی اور اندر اُسی ماہپارہ کی تصاویر جس کی بولی سرِعام لگ رہی تھی اور اُس کی پہچان تھی زین حمادی۔



شام سے پہلے شام ہونے کو تھی۔ شام کے دھند لکے ہر چیز کو اپنی آغوش میں تیزی سے بھرتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت جب رات کی کالی چادر نے ہر چیز کو اپنی آغوش میں سلانا شروع کر دیا تھا۔ موسم نے یک لخت کروٹ بدلنا شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں نے ستاروں اور چاند کو اپنی اوٹ میں چھپا لیا۔

موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ویسے تو نومبر کے اوائل دن تھے۔ لیکن موسم کی بدلتی کروٹ نے یک لخت موسم اتنا خراب کر دیا تھا کہ چارو ناچار لوگوں کو بستروں میں دبکنا پڑا تھا۔

عمران کو بس سٹاپ پر کھڑے کافی سمے بیت چکا تھا لیکن ابھی تک گاڑی نہیں آئی تھی۔ موسم کی بدلتی کروٹ نے اس [illegible] بار

گرجا اور بجلی کی چمک نے چہار سو اجالا پھیلایا۔ جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا. عمران کی پریشانی میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ عین اس وقت جب وہ گھڑی پر ٹائم دیکھ رہا تھا۔ دور سے آتی گاڑی کے ہارن نے اس کی سماعت پر دستک دی اور خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

عمران سرعت سے آگے بڑھا اور بس کو اشارہ کیا۔ بس اس کے قریب آ کر رک گئی۔ عمران لپک کر بس میں سوار ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت ہو یدا رہ گئی کہ بس کے اندر ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک سواری تھی۔ بس کے اندر نہ تو مزید کوئی سواری تھی اور نہ ہی بس کا کنڈکٹر موجود تھا۔

عمران اس سواری کے ساتھ والی سیٹ پر سرعت سے براجمان ہوگیا۔ ابھی تک اس نے اس سواری کو نہیں دیکھا تھا۔ عمران نے جو لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ سردی کی سختی کو روکنے کے لیے ناموزوں تھا۔ جس کی وجہ سے عمران بری طرح سے کانپ رہا تھا۔

سردی سے کانپتے عمران کی نگاہ یک لخت اس سواری پر پڑی۔ اور وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس پری پیکر کو دیکھ کر عمران کے اندر سے سختی کا احساس ہی ختم ہوگیا تھا۔ تو یہ بات بجا ہوگی۔ اس لڑکی کے لباس سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ لڑکی بھی متواتر عمران کو ہی تکے جارہی تھی۔ عمران اس سے آنکھیں ملانے کی جسارت نہ کر پا رہا تھا۔ لیکن اس پری پیکر کا چہرہ جیسے اس کے دل ود ماغ پر قابض ہوگیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس پری پیکر کے چہرے کو تکے بنا نہ رہ پا رہا تھا۔

گاڑی اپنی رفتار سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور بار بار کن اکھیوں سے آئینے میں اس پری پیکر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ عمران بھی اس لڑکی کو گھور رہا تھا۔ اور یہی نہیں وہ پری پیکر بھی عمران کو تکے جارہی ہے۔ ڈرائیور کافی عمر کا ہونے کے باوجود اس لڑکی پر ہوس کی نگاہ جمائے

ہوئے تھا۔

عمران کباب میں ہڈی کی طرح ثابت ہوا تھا۔ وہ تو اسے چڑھانا نہیں چاہتا تھا لیکن لڑکی نے عمران کو ہاتھ سے اشارہ کرتے دیکھا اور ڈرائیور کو زور سے آواز دے کر کہا تھا کہ سواری بٹھا کر آگے چلے۔ دوسری طرف موسم تھا کہ پہلے سے زیادہ خراب ہوئے جا رہا تھا۔ خنکی حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ جس کی وجہ سے رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔

لڑکی نے اپنے سیٹ کے پاس پڑے سفری بیگ سے ایک چادر نکال کر عمران کی طرف بڑھائی۔

''لگتا ہے آپ کو کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہو رہی ہے؟'' لڑکی نے چادر عمران کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

عمران نے سرعت سے چادر تھام لی اور اپنے جسم پر لپیٹ لی۔

''تھینکس۔'' عمران نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' لڑکی نے شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

گاڑی شکر گڑھ سے ابھی کافی دور تھی۔ شکر گڑھ کی طرف آنے والا یہ راستہ بالکل سنسان راستہ تھا۔ جسے ڈرائیور نے اپنی ہوس کی خاطر اپنایا تھا لیکن اس کی ہوس کی پیاس اسے بجھتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ نفرت بھری نگاہوں سے بار بار آئینے میں اس پری پیکر اور عمران کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے درمیان گفت و شنید کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔

آناً فاناً گاڑی کو ایک چھوٹا سا جھٹکا لگا اور گاڑی رک گئی۔ گاڑی اس وقت شکر گڑھ سے تقریباً بارہ تیرہ کلومیٹر پیچھے چھمال کے قریب رکی تھی۔ عمران اور وہ اپسرا دونوں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر اس ڈرائیور کو گھورنے لگے۔

''کیا ہوا انکل؟'' [illegible]

''مجھے کیا پتہ؟'' ڈرائیور نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ ڈرائیور ہیں۔'' اس پری پیکر نے ڈرائیور کو یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کو نہیں پتہ تو اور کس کو پتہ ہوگا؟''

لڑکی کے انداز میں حیرانگی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ اسے شاید ڈرائیور کی بات پر تاؤ چڑھ گیا تھا۔ ڈرائیور نے لڑکی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ تاکہ دیکھ سکے کہ بس میں کیا مسئلہ درپیش آیا ہے۔

''بڑا عجیب انسان ہے یہ۔'' لڑکی نے ڈرائیور کے اترنے کے بعد عمران کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' عمران نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی میں کوئی مسئلہ بن گیا ہے۔ جو میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''اس لیے جب تک موسم ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہم سب کو یہیں رکنا پڑے گا۔ تاکہ موسم ٹھیک ہو تو کسی سے رابطہ کر کے اسے یہاں بلوایا جا سکے۔ موبائل کے سگنل بھی نہیں ہے۔ اگر تم میں سے کسی کے موبائل پر سگنل آ رہے ہیں۔ تو اپنا موبائل مجھے دو تاکہ میں رابطہ کر کے کسی مستری کو یہاں بلوا لوں۔''

ڈرائیور اپنی سیٹ سے منہ پیچھے کر کے بولے جا رہا تھا۔ جب عمران اور وہ پری پیکر ہکا بکا ہو کر اسے تکے جا رہے تھے۔

''اس اندھیری اور طوفانی رات میں ہم اس وقت تک یہاں رہیں گے جب تک موسم ٹھیک نہ ہو جائے؟'' اس پری پیکر نے سوالیہ آنکھوں سے ڈرائیور کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اور کوئی حل بھی تو نہیں ہے۔'' ڈرائیور نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''امپاسبل۔'' لڑکی ناک بسوڑتے ہوئے بولی۔

''آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس گاڑی میں ہونے والی پرابلم کو دیکھیں۔ تاکہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلیں۔ ایسے تو ساری رات یہاں نہیں نہ گزاری جاسکتی۔ ایک تو موسم خراب ہے۔ اوپر سے رات ...... امپاسبل۔ کچھ بھی ہو آپ چیک کیجئے۔ ہمیں ابھی چلنا ہے یہاں سے۔''

لڑکی کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ عمران اس کے لہجے پر جہاں حیرت زدہ تھا۔ وہیں وہ ڈرائیور پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ وہ پہلے ہی عمران کی وجہ سے غصے سے آگ لال پیلا ہوئے جا رہا تھا۔ اوپر سے اس لڑکی نے اس کا دماغ خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔

''میم صاحب۔'' ڈرائیور دانت پیستے ہوئے بولا۔

''اتنی ہی جلدی ہے تو یہ سیدھا راستہ جا رہا ہے۔ اٹھایئے اپنا سامان اور ہو لیجئے اپنے راستے پر۔ یہ آپ کی گاڑی نہیں بلکہ پبلک ٹرانسپورٹ ہے۔ اگر آپ کو ٹھیک کرنی آتی ہے تو نیچے اتر کر اس کارخیر میں شامل ہو جایئے ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھی رہو۔''

لڑکی ڈرائیور کی بات سن کر پیچ وتاب کھا کر رہ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیگ اٹھالیا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟'' عمران نے اس پری پیکر سے پوچھا۔

''میں پیدل جاؤں گی۔'' لڑکی نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

''وٹ یو مین؟'' عمران اس کی بات سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''آپ جانتی ہیں کہ رات کے اس پہر جب ہر طرف رات کی کالی چادر تنی ہوئی ہے۔ اور اوپر سے موسم اتنا خراب [illegible] بارش ہو رہی ہے ایسے موسم میں [illegible] باتیں۔''

لڑکی نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے چپ کروا دیا۔

''میرے خیال میں میں نے ابھی تک آپ کو ساتھ چلنے کا نہیں کہا؟'' لڑکی نے اسے یاد دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''رات کے اس پہر ایک اکیلی لڑکی کا ایسے موسم سفر کرنا بہتر نہیں ہے۔'' عمران نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟'' لڑکی نے سوالیہ آنکھوں سے بیگ اٹھا کر عمران کو دیکھا۔

''مم...... میں؟'' عمران نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''شاید میں نے آپ کو ہی کہا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

''ویسے امید نہیں ہے کہ آپ میرے ساتھ چل سکیں کیونکہ آپ کو پہلے ہی اتنی ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے۔''

لڑکی کے لہجے میں طنز کی کڑواہٹ کو عمران نے پہلے ہی محسوس کیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔

اتنا کہہ کر عمران اپنی جگہ پر ایستادہ ہو گیا۔ لڑکی چپ چاپ گاڑی سے باہر نکل گئی۔ ڈرائیور حیران کن آنکھوں سے ان دونوں کو گھور رہا تھا لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ دونوں تھوڑی دور جا کر اندھیری رات کے خوف سے یا موسم کی سختی سے گھبرا کر واپس آ جائیں گے لیکن وہ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کی ضد کے سامنے کوئی چیز ٹک نہیں پاتی۔

عمران بھی اس لڑکی کے پیچھے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ دونوں سڑک پر چلتے جا رہے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کر دی تھیں تا کہ وہ دونوں اسے دکھائی دیتے رہیں۔ عمران نے اترتے ساتھ ہی اس دوشیزہ کے ہاتھ سے اس کا سفری بیگ تھام لیا تھا۔

''ویسے ابھی تک آپ نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا؟'' عمران نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''رابعہ۔'' اس دوشیزہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''بہت پیارا نام ہے۔'' عمران نے تعریفانہ انداز میں کہا لیکن رابعہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''ہم اگر اسی طرح روڈ پہ چلتے رہے تو ممکن ہے کوئی نہ کوئی گاڑی پیچھے سے آ جائے۔''

عمران کی بات سن کر لڑکی رک گئی۔ اسے رکتا دیکھ کر عمران بھی رک گیا۔ دوسری طرف ڈرائیور ان دونوں کو رکتا دیکھ کر زیرلب مسکرا دیا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ دونوں اب واپس پلٹنے والے ہیں۔

''اگر ہم جنگل کے اندرونی راستے کو اختیار کریں تو تھوڑی ہی دیر میں یا تو کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے۔ یا پھر جلد ہی شکر گڑھ کے قریب سے جا نکلیں گے۔'' رابعہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''رات کے اس پہر جنگل کا راستہ اپنانا بہتر نہیں ہے۔'' عمران نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ لڑکا ہو کر آپ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔'' لڑکی نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عمران جھینپ کر رہ گیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' عمران نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ رات کے اس پہر جنگل کا راستہ ہمارے لیے غیر محفوظ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی مشکل سے دوچار ہونا پڑ جائے۔ اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔' رابعہ نے عمران کے ہاتھ سے بیگ تقریباً کھینچ کر خود پکڑ لیا۔

''بہت بزدل انسان ہیں آپ۔''

رابعہ عمران کے ہا[illegible] دوسری

Downloaded from https://paksociety.com

طرف ڈرائیورانہیں جنگل کی طرف جاتے دیکھ کر گنگ رہ گیا۔اس کے ہوس بھرے ذہن میں شیطان نے پناہ لینا شروع کردی۔وہ یہی سمجھا کہ شاید عمران اسے جنگل میں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے لئے جارہا ہے۔

ڈرائیور کے اندر کا شیطان سر اٹھانے لگا۔اس نے تہیہ کرلیا کہ بجائے گاڑی میں بیٹھنے کے کیوں نہ ان کا پیچھا کیا جائے۔یہی سوچ کروہ ان کے پیچھے سرعت سے چل دیا۔

دوسری طرف ایک بار پھر عمران نے آگے بڑھ کر رابعہ کے ہاتھ سے اس کا سفری بیگ تھام لیا۔

دونوں چلتے جارہے تھے لیکن کافی دیر تک دونوں کے درمیان کسی قسم کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔عمران رابعہ سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ رابعہ رک گئی۔عمران بولتے بولتے چپ ہوگیا اور سوالیہ نگاہوں سے رابعہ کو گھورنے لگا۔دوسری طرف ڈرائیوران کے تقریباً قریب ہی پہنچ چکا تھا اور ایک درخت کی اوٹ سے ان دونوں کو گھورنے لگا۔وہ دونوں کی ہر ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

''کیا ہوا......؟''عمران نے اسے سوالیہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

جواباًرابعہ نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا۔عمران نے جب اس کی انگلی کے اشارے کی طرف دیکھا تو حیران و ششدر رہ گیا۔جس طرف رابعہ نے اشارہ کیا تھا۔اس طرف دھواں دھواں دکھائی دے رہا تھا۔بجلی بار بار چمک رہی تھی۔جس میں دھواں مترشح دکھائی دے رہا تھا۔عمران کو جیسے جیسے اس دھوئیں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ویسے ویسے اس کا پورے ذہن پر دھند کی چادر چھانے لگی تھی۔

دوسری طرف ڈرائیور حیرانگی سے اس طرف دیکھے جارہا تھا۔جس طرح رابعہ نے اشارہ کرکے عمران کو دیکھنے کو کہا تھا لیکن اسے کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔جس کی وجہ سے وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر کبھی عمران کو دیکھتا تو کبھی اس مہ جبیں کو جس نے اسے اپنا دیوانہ کرلیا تھا۔اچانک

ڈرائیور نے جو منظر دیکھا۔اسے دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔

☆......☆......☆

عمران کے گھر نہ پہنچنے پر اس کے گھر میں ہلہ گلہ مچ گیا تھا۔اس کے بھائی نے اس کے دوستوں کے ہاں سے پتہ کیا لیکن سب اس بات سے ناواقف تھے کہ وہ کہاں ہے۔مگر سب عمران کے بھائی ریحان کے ساتھ ہو لیے تھے۔

عباس اور اشتیاق دونوں عمران کے بھائی ریحان کے ساتھ ساتھ تھے۔سب کے چہرے پر پریشانی کی سلوٹیں عیاں تھیں۔تینوں نے تہیہ کیا کہ شہر جا کر اس جگہ سے پتہ کریں جہاں عمران ڈیوٹی کرتا تھا۔لیکن عمران کے والدین انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ایک تو اندھیری رات تھی۔دوسرا موسم اتنا خراب تھا کہ اس موسم میں سفر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

بہت چاہنے کے باوجود بھی انہیں اجازت نہ مل سکی تھی۔بے شک عمران کے گھر والے بھی اس کے نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھے لیکن سب نے یہ سمجھ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ ممکن ہے۔موسم کی خرابی کی وجہ سے اسے کسی نے آنے نہ دیا ہو۔عمران ایک میڈیکل سٹور پر کام کرتا تھا اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات وہیں رک جاتا تھا۔لیکن جب بھی وہ وہاں رکتا تھا گھر فون کر کے ضرور بتاتا تھا۔

آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ ابھی تک واپس بھی نہیں آیا تھا۔اور اس نے فون بھی کر کے نہیں بتایا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف عمران حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر آس پاس دیکھ رہا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا ہو۔پھر یکبارگی وہ دھواں چھٹنے لگا تو اس کے ذہن کی پچی ٹاکی پر رابعہ کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

اس نے سرعت سے ادھرادھر دیکھا لیکن اگلا منظر دیکھ کر حیران و ششدرره گیا۔ رابعہ کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔

دوسری طرف ڈرائیور نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ عمران کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جس طرف رابعہ نے اشارہ کیا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے رابعہ یوں غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ غائب ہوتے ہیں۔ ڈرائیور سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا اور سیدھا جا کر گاڑی میں براجمان ہوگیا۔ اس کا سانس بری طرح سے پھولا ہوا تھا۔ گاڑی کے اندر اس نے وظائف والی ایک چھوٹی سی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے وہ کتاب نکال کر سینے سے لگا لی۔ دوسرے ہی لمحے اسے عمران کا خیال آیا۔ اس نے رب کا نام لیا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے دل میں پناہ گزیں شیطان نکل چکا تھا۔ اب اس کے دل میں ایک احساس مند انسان جنم لے چکا تھا۔ جو اسے بار بار عمران کی مدد کرنے پر اکسا رہا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے پرکھوں سے سنا ہوا تھا کہ روحانی علوم کے سامنے شیطانی علوم کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اس وظائف والی کتاب کو سینے سے لگائے وہ متواتر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ عمران کی طرف سے اسے کافی پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ خوبصورت دوشیزہ لڑکی نہیں بلکہ کوئی اور ہی مخلوق تھی۔ یہی نہیں اسے اتنا پتہ چل چکا تھا کہ عمران کسی مصیبت میں دو چار ہو چکا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ مخلوق اس پر پوری طرح سے حاوی ہو جائے وہ ہر ممکن عمران کو بچانا چاہتا تھا۔

دوسری طرف عمران اپنی جگہ پر حیران و پریشان ایستادہ تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار ادھرادھر گھوم رہی تھیں۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک جگہ رک گئیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک جگہ سے روشنی دکھائی دے رہی

تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عمران اس کی روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے امید لگ گئی کہ ہو نہ ہو رابعہ اسی طرف گئی ہو گی۔ جس طرف سے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔

جیسے جیسے عمران آگے بڑھ رہا تھا۔ ویسے ویسے وہ روشنی کا دکھائی دینے والا چھوٹا سا نقطہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور جب عمران اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے وہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ تو اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا رہ گئی۔ وہ روشنی ایک محل نما عمارت تک اسے لے آئی تھی۔ عمران کی حیرت ہویدا رہ گئی کہ اس جنگل میں ایسی محل نما عمارت کس نے بنائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں رابعہ کا خیال آیا۔ رابعہ کا خیال آتے ساتھ ہی وہ اس عمارت میں داخل ہو گیا۔

وہ محل نما عمارت باہر سے جتنی سندر دکھائی دے رہی تھی۔ اندر سے اس سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ عمران کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حقیقت میں کسی محل میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اندر کوئی بھی انسان اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عمران پیہم آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

عمران کو اپنے اردگرد لمبی راہداریاں دکھائی دے رہی تھی۔ ان راہداریوں میں ان گنت کمرے بنے ہوئے تھے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک کمرے پر پڑی جس میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ ویسے تو راہداری میں بھی روشنی تھی۔ لیکن اس کمرے سے نکلنے والی روشنی اتنی تیز تھی کہ عمران کو حیرت محسوس ہوئی۔

عمران کی چھٹی حس اسے انجانے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی لیکن اس کے دل و دماغ پر رابعہ چھائی ہوئی تھی۔ جو اسے بیچ جنگل چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔ عمران اس کمرے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ جس میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ عمران نے تھوڑا سا دباؤ دروازے پر دیا تو دروازہ

کھلتا چلا گیا۔

اگلا منظر دیکھ کر عمران حیرت و خوشی سے پاگل سا ہو گیا۔اس کے سامنے ایک نرم و گداز بستر پر رابعہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔عمران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔رابعہ کا چہرہ اب پوری طرح سے اس کے سامنے تھا۔

اچانک رابعہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور عمران کو اپنائیت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔رابعہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔رابعہ نے اپنی باہیں یوں پھیلا رکھی تھیں جیسے وہ عمران کو اپنے گلے سے لگانے کی خواہش مند ہو۔

''یہ کیا بات ہوئی بنا بتائے ہی وہاں سے تم نو دو گیارہ ہو گئی۔''عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''میرے گلے لگ جاؤ عمران۔''رابعہ نے اس کی بات کو پس پشت ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتے کہ کتنے دنوں کی بھوکی پیاسی ہوں میں۔''

عمران رابعہ کی بات کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔دوسرے ہی لمحے عمران رابعہ کے گلے لگ گیا۔لیکن اگلے ہی لمحے ایک کرب و اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخ عمران کے حلق سے خارج ہو گئی۔

☆......☆......☆

دوسری طرف ڈرائیور متواتر عمران کا پیچھا کرتے کرتے اس عمارت میں داخل ہو گیا۔عمران نے اس کی موجودگی کو ابھی تک نہیں بھانپا تھا۔ڈرائیور اس کے پیچھے پیچھے ہی چلا جا رہا تھا۔عمران ایک کمرے کے سامنے رکا تو ڈرائیور کو تشویش ہوئی۔وہ ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو کر اسے تکنے لگا۔جیسے ہی عمران اس کمرے میں داخل ہوا ڈرائیور سرعت سے اس کمرے کی طرف بڑھا لیکن اگلا منظر اس نے

جو دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔

ایک بدصورت چڑیل اپنے لمبے لمبے دانت عمران کی گردن میں پیوست کر چکی تھی۔ جبکہ عمران کے حلق سے ایک سماعت شکن چیخ برآمد ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے ڈرائیور کمرے میں داخل ہوا تو یکبارگی اس چڑیل نے عمران کو چھوڑ دیا اور حیرت سے ڈرائیور کو تکنے لگی۔

عمران کو اس نے اچھال کر دیوار میں مارا تھا۔ عمران دیوار سے اتنی زور سے جالگا تھا کہ گرتے ساتھ ہی بے ہوش ہو گیا۔

''نکل جاؤ یہاں سے۔'' اس بدصورت چڑیل نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''اس کتاب کو دور رکھو مجھ سے۔''

''تو یہ ہے تمہارا اصلی چہرہ۔'' ڈرائیور نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے للکارا۔

''مجھے اسی وقت شک پڑ گیا تھا۔ جب میں نے تمہیں جنگل میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔'' ڈرائیور نے اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

''میں تمہیں بھی مار ڈالوں گی وگرنہ نکل جاؤ یہاں سے۔'' اس بدصورت چڑیل نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تمہاری جرأت سے بھی باہر ہے مجھے مارنا۔'' ڈرائیور نے وظائف والی کتاب کو سینے سے چپکاتے ہوئے کہا۔

''موت تو تمہاری لکھی جا چکی ہے خبیث چڑیل۔''

اتنا کہہ کر ڈرائیور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس بدصورت چڑیل کی حالت کافی دگرگوں دکھائی دے رہی تھی۔

اتنی دیر میں عمران بھی ہوش میں آچکا تھا۔ وہ ڈرائیور کو دیکھ کر خوشی سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ جہاں وہ رابعہ کی اصلیت سے ہوش سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ وہیں ڈرائیور کو دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔

''اسے مارڈالو خدا کے لیے۔'' عمران نے روتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا تو ڈرائیور سمیت اس بدہیبت چڑیل نے بھی اس کی طرف دیکھا۔

''تم خاطر جمع رکھو عمران۔'' ڈرائیور نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں جو بھی قرآنی آیات آتی ہیں۔ ان کا زور زور سے ورد کرو عمران۔ یہ چڑیل یہاں سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ میرے ہاتھ میں کلام الٰہی ہے۔ اور جب تک میں دروازے کے سامنے کھڑا ہوں یہ اس طرف قدم بھی نہیں رکھ سکتی۔ آج اس کی موت لکھی جا چکی ہے۔''

ڈرائیور نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو عمران نے اونچی آواز میں قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

''میرے مالک میرا وضو نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں کس حالت میں ہوں لیکن آج میں تیرے ایک بندے کی نہ صرف مدد کرنا چاہتا ہوں بلکہ ایک آدم خور کو ابدی نیند سلانے کا جذبہ رکھتا ہوں۔ مجھ پر رحم فرما اور اس خبیث چڑیل کا خاتمہ فرما۔'' ڈرائیور نے وظائف کی کتاب کھولتے کھولتے دل ہی دل میں دعا کی اور دوسرے ہی لمحے وہ کتاب کھول کر سورۃ یسین اونچی آواز میں پڑھنی شروع کر دی۔

اس بدصورت چڑیل کی چیخیں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھا ہوا تھا تاکہ عمران اور ڈرائیور کی آواز اس کی سماعت سے نہ ٹکرائے لیکن عمران اور ڈرائیور اتنی اونچی آواز میں ورد کر رہے تھے کہ اس کی ہر سعی بےکار ثابت ہوئی۔ اس چڑیل کی حالت سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شدید کرب و اذیت کا شکار ہے۔

دوسرے ہی لمحے ایک ناقابل یقین واقعہ رونما ہوا۔ عین اس وقت جب ڈرائیور نے سورۃ یسین مکمل کی

اس بدصورت چڑیل کے جسم نے آگ پکڑ لی۔ڈرائیور نے آگے بڑھ کر عمران کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

''جلدی کرو بھاگو یہاں سے۔''ڈرائیور نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔

عمران نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دونوں سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ابھی دونوں اس عمارت سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں یوں لگا جیسے کوئی زوردار دھماکہ ہوا ہو۔انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو اگلا منظر دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔وہ عمارت زمین بوس ہو چکی تھی۔اور ہر طرف گرد و غبار پھیل چکا تھا۔

باہر بارش رک چکی تھی۔مطلع بھی بالکل صاف ہو چکا تھا۔دونوں کلام الٰہی کا ورد کرتے ہوئے بس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میں آپ کا از حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری جان بچائی۔''عمران نے ڈرائیور کی طرف مشکور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

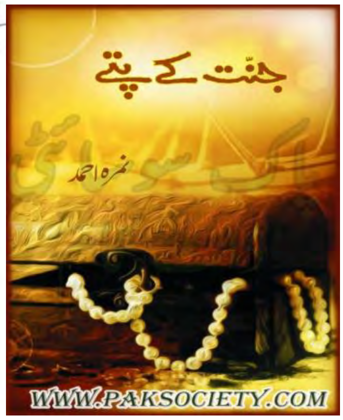
''شکر اس خالق کا کرو جس نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ میں تم دونوں کا پیچھا کروں۔'' ڈرائیور نے اسے بتایا اور پھر ساری بات سے آگاہ کیا کہ وہ کس طرح اس چڑیل (رابعہ) پر فدا ہوئے بیٹھا تھا۔

پھر ان دونوں کو جنگل میں جاتے دیکھ کر وہ بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔اور پھر جو کچھ اس نے دیکھا تھا۔سب اسے بتایا۔دونوں بس میں جا کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ڈرائیور نے چابی گھمائی تو گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

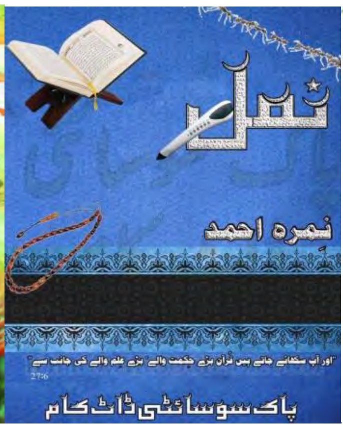
''یہ سب اس چڑیل کا کیا کرتا تھا۔''ڈرائیور نے کہا تو عمران اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مین نے گاڑی کو اچھی طرح سے چیک کیا تھا۔اس کے اندر کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن

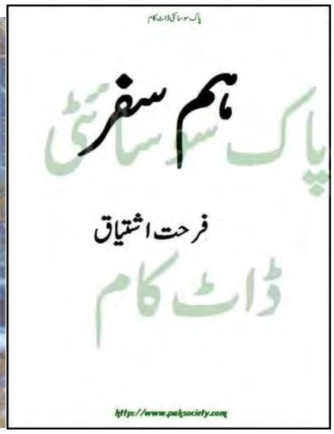
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

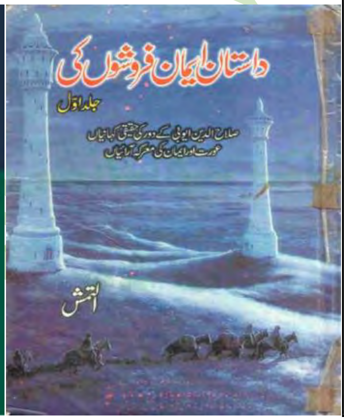




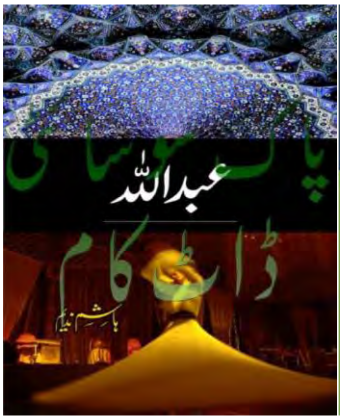


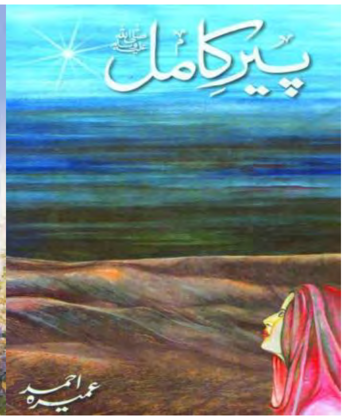


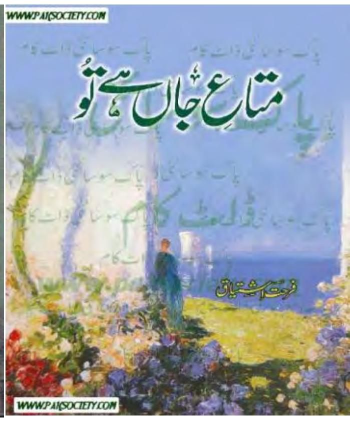


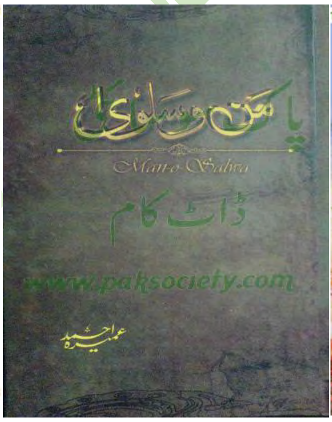




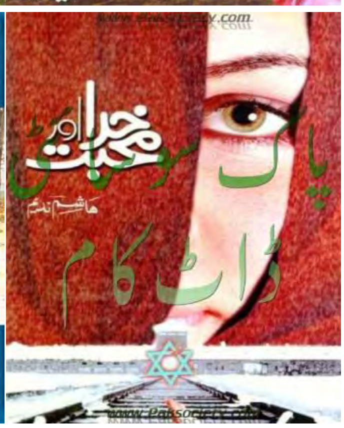


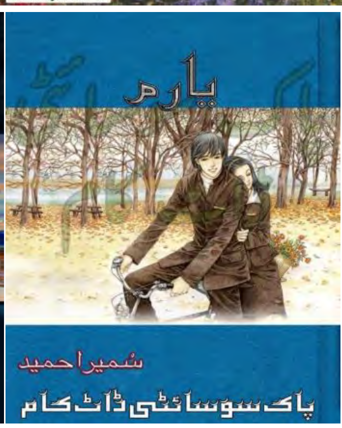




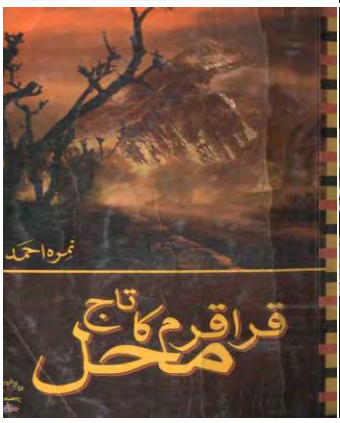












باوجود اس کے وہ بند ہوگئی تھی۔ اب ساری بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ یہ اس کی بچھائی ہوئی بساط تھی لیکن افسوس کہ اس کی چال اس پر بھاری پڑ گئی۔''

ڈرائیور نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور شکرگڑھ کی طرف چل دیا۔ دونوں کتنی ہی بار اس خالق کا شکر ادا کر چکے تھے۔ جس نے انہیں ایک نئی زندگی دی تھی۔

خوبصورت دعا

تمہیں کبھی نہ کوئی دکھ ملے
تمہیں زندگی کا ہر سکھ ملے
تمہارا دل نہ ہو کبھی خفا
تم مسکراتے رہو سدا
رحیم تم پہ رحم کرے اور
دکھائے تم کو روضۂ مصطفیٰ
تمہارے گھر میں بھی سکون ہو
اور ٹل جائے ہر بلا

طاہر عباس۔شجاع آباد

☆......☆......☆

کبھی پوچھ کر تو دیکھو ہم سے اپنی یادوں کا عالم ساگر
گزر جاتی ہے ساری رات ستاروں سے تیرا ذکر کرتے کرتے

اشتیاق احمد۔شکر گڑھ

☆......☆......☆

لوگوں نے روز ہی کچھ نیا مانگا خدا سے صاحب
اک ہم ہی تیرے خیال سے آگے نہ جا سکے

منور عباس گرو۔سلانوالی،سرگودھا

اندھیری قبر کو خود ہی روشن کرنے کی تیاری کر اقبال
آج حیات روح سے کوئی وفانہیں کرتا،
کل مٹی کے ڈھرکے لیے دعاکون کرے گا۔

نشاء۔ایبٹ آباد

☆......☆......☆

دل ودماغ نہیں متفق پاک ہند کی طرح
یہ محبت تو مجھے مسئلہ کشمیر لگتا ہے۔

محمدعرفان بھٹی۔کلری اڈہ

☆......☆......☆

عشق طلوع ہوا ہے جب سے
دنیا میری نظر میں غروب ہوگئی۔

محمدسفیان(رائٹر)

☆......☆......☆

آنکھ کا اعتبار کیا کرتے
جو بھی دیکھا خواب میں دیکھا

محمدسفیان(رائٹر)

☆......☆......☆

پھروہی اپنے پرانے سے ٹھکانے مانگے

دل وہ بے مہر کے رونے کے بہانے مانگے
تیری بانہوں میں بھی ملتانہیں اس اب اس کو سکون
اب کسی اور کے سونے کو سرہانے مانگے
یہ اپنی محبت توکب کی بھول چکی
نت نئے روز یہ دنیا تو افسانے مانگے
پہلے ہر بات کو سلجھانے کے جتن ہوتے تھے
اب تو ہر ابت بڑھانے کے بہانے مانگے
میرا یہ حال کہ آن پہنچا ہوں اب مرنے پہ
تیرا یہ بے عشق وہی انداز پرانے مانگے
اے ظفر درد بہت جھیلے ہیں تیرے دل نے مگر
یہ اب بھی اور سدھرنے کو زمانے مانگے

ظفر اکبر گلاب......لغاری سندھ

☆......☆......☆

ہاتھ تھام لیتا ہے دوا دیتا ہے
دشمنوں کو کیا عجب سزا دیتا ہے
زمانہ تجھ پہ انگلیاں اٹھاتا ہے
تو زمانے کو اپنا بنا لیتا ہے
زخموں سے جب اشک بہانے ہوں

تنہائی کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے۔
چوم کر بھی امر ہونا چاہیں ان کو
پیار کا آب حیات پلا دیتا ہے
جو آنکھوں میں کھٹکتے ہیں ہمہ وقت
تو انہیں نظروں سے گرا دیتا ہے
تو بھی کمال کا ساحر ہے اسامہ
دیکھتے ہی سب کچھ اگلوا لیتا ہے۔

اسامہ منور......سیالکوٹ

☆......☆......☆

کسے خبر تھی چراغوں کی لو بڑھاتے ہوئے
ہوا کے ہاتھ جلیں گے انہیں بجھاتے ہوئے
کسی کا تختہ ہو کوئی مقتل ہو۔
سروں کو خم نہیں کرتے فقیر جاتے ہوئے
ہمارا عشق تمہاری سمجھ سے باہر ہے
کہ ہم جدا بھی ہوئے ہیں تو مسکراتے ہوئے
یوں بات بات پہ رک کر صفائیاں تو نہ دے
میں مطمئن ہوں میری جاں فریب کھاتے ہوئے
کہیں تو کوئی تعلق بچا ہوا ہوگا

وگرنہ یوں تو نہ روتا گلے لگاتے ہوئے
میرے خمیر کو جب درد میں وہ گوندھ چکا
رکا تو ہوگا مجھے چاک پر گھماتے ہوئے
ذرا سی دیر میں پاتال میں اتر گئے لوگ
زمیں کا ذوق بنے چہرے مسکراتے ہوئے

نظامت حسین......آزاد کشمیر

☆......☆......☆

ڈوبے ہیں تیرنے پہ ابھارے نہیں گئے۔
ہم لوگ ساحلوں سے پکارے نہیں گئے۔
یہاں قید اب بھی تیری رفاقت کے سحر میں
تیرے ساتھ بیتے لمحے گزارے نہیں گئے
ہم کب کے بھول بیٹھے ہیں یادوں کے پیڑ سے
بے جان اب بھی اتارے نہیں گئے
بٹتی تھیں تیرے شہر میں خوشیاں ولیک کم
بارے گئے ہیں دیر سے بارے نہیں گئے
لٹنے کی فکر چھوڑیئے یہ راہ عشق ہے۔
صدحیف ہم جو راہ میں مارے نہیں گئے۔

شہزاداحمد کھرل.....جلالپور جٹاں گجرات

☆......☆......☆

اے عشق بہت رنجور کیا
دکھ درد غموں سے چور کیا
خوش تھا میں تیرے ملنے سے پہلے
اب رونے پہ مجبور کیا
کب اپنی شناسائی تھی یہاں
بدنام کیا مشہور کیا
وہ تیرے تصور میں جو لکھا
بس اس نے بہت مسرور کیا
چاہت نے تیری ہم کو تو فقط
سوچوں پہ تیری معمور کیا
وہ ترک زکیر اب عشق کریں جس عشق نے سب سے دور کیا

ذکیراحمدبھٹی......جدہ سعودی عرب

☆......☆......☆

جو میرے بولنے سے پہلے میرے دل کی بات جان لے
میری خوشی اس کو ہر دل عزیز ہو
جس کو کھونے کے احساس سے میں ڈر جاتی ہوں
وہ میری آنکھوں سے میری تکلیف کو محسوس کرے

جو میرے چپ رہنے پہ تڑپ اٹھے
وہ آئے میری زندگی میں اور میں مکمل ہوجاؤں
جس کے روٹھنے کے ڈر سے میری سانس رکنے لگے
پھر بھی میں ڈرتی ہوں اس کو پانے سے کہ
کہیں اسے کھو نہ دو ں
اے کاش! کوئی ایسا بھی ہو......

آمنہ رشید.....پیر محل

☆.....☆.....☆

اہم اعلان

شاہین ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ اگست میں شائع ہوگا اوراس کے اندر ''آپ کے مسائل اوران کا حل''،''بیماریاں اوران کا علاج'' اور ''ستارے کیا کہتے ہیں؟'' قارئین کے لیے شامل کیے جارہے ہیں۔ اپنے مسائل،بیماریوں کے علاج اورستاروں کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں ابھی سادہ کاغذ پراپنے مسائل لکھ کرفوراًارسال کریں۔ستاروں کے بارے میں جاننے کے لیے اپنا مکمل نام،والدہ کا نام اورتاریخ پیدائش لکھ کر بھیجنالازمی ہے۔شکریہ

محمد ندیم عباس ہیواتی (ایڈیٹر شاہین ڈائجسٹ)

Downloaded from https://paksociety.com



علی کا مکمل دھیان ان لوگوں کی طرف تھا جو ایک قافلے کی شکل میں آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھنا جان جوکھم کا کھیل ہوتا ہے لیکن وہ ایسے چڑھ رہے تھے جیسے وہ کسی پہاڑ پر نہیں بلکہ میدانی علاقے میں کسی پگڈنڈی پر سے گزر رہے ہوں۔

ان کے چہروں پر لمبی لمبی داڑھی، سر پر سفید ٹوپیاں اور یہی نہیں لباس بھی سفید زیب تن کیا ہوا تھا۔ ظاہری طور پر دیکھنے میں وہ تبلیغ دین کے لیے نکلنے والے قافلے کی مانند تھے لیکن درحقیقت وہ انڈیا کے تربیت یافتہ جاسوس تھے۔ جو کشمیر، فلسطین اور پاکستان سمیت اسلامی ممالک میں گھس کر وہاں کا سکھ چین خراب کرنے کی ناکام سعی کرتے ہیں اور ایک دن کتے کی موت مرجاتے ہیں۔ معصوم بچوں کو اغوا کروا کے انہیں تربیت دیتے ہیں

کہ لوگوں کے ہجوم میں دھما کہ کر کے سیدھا جنت میں داخل ہو جاؤ۔

علی ساری حقیقت سے آشنا تھا۔اسے کوئی اغوا کر کے نہیں لایا تھا بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے آیا تھا۔زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دنیاوی آرائش وزیبائش کے لیے وہ اپنی اخروی زندگی کو داؤپر لگانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسلام میں حرام کی موت سے منع کیا گیا ہے۔اورحرام کی موت مرنے والے کے لیے جنت کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں لیکن وہ اپنے گھریلو حالات سے تنگ آچکا تھا۔اس کی تینوں بہنیں جوان ہوچکی تھیں۔

اس کا باپ دن بھر فروٹ کی ریڑھی لگا تا تھا اور اس سے بس اتنا کچھ گھر آ جا تا تھا۔جس سے گھر کا دال پانی چل رہا تھا۔وہ اپنی بہنوں کو اچھے گھرانوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔اس کے لیے اسے ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

علی نے ایم فل مکمل کرلیا تھا لیکن کوئی جاب اسے نہ مل رہی تھی۔اگر کہیں بات بنتی دکھائی دیتی بھی تو وہ اتنی رشوت مانگ لیتے کہ اس کے پیروں تلے زمین کھسک جاتی۔اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب کوئی چور راستہ تلاش کر کے ہی نہ صرف وہ اپنے حالات بہتر بنائے گا بلکہ اپنی جوان بہنوں کے اچھے گھر بھی بنائے گا۔ا

انہی دنوں اس کے ذہن میں کرم دین پرچون والے کا خیال آیا۔کرم دین کو اس نے ساری زندگی ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان پر دیکھا اور پھر یک لخت ہی اس کے حالات یوں تبدیل ہو گئے کہ وہ کروڑ پتی بن گیا۔آج تک یہ راز کوئی نہ جان پایا تھا لیکن کرم دین سے ملاقات کے بعد صرف اسے ہی معلوم ہو سکا کہ اس نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی دے کر یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ بہت سوچ و بچار کے بعد علی نے کرم دین سے کہا کہ اسے بھی ان لوگوں سے ملوائے۔

یوں علی کو کرم دین نے ان لوگوں سے ملوایا اس کا نام جسونت تھا۔اس نے علی سے وعدہ کیا کہ اس کے گھر ایک کروڑ روپیہ دے گا۔علی نے کہا کہ وہ اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے لیکن اس سے پہلے اپنی بہنوں

کے گھر بنتے وہ خود یکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ساری بات تہہ ہوگئی اور علی کو ایک کروڑ مل گیا لیکن ساتھ ہی سختی سے تنبیہہ بھی کردی گئی کہ اگر اس نے دغابازی کی تو اس کی پوری فیملی کو اڑا دیا جائے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ علی کچھ اور ہی ارادہ بنا چکا تھا۔

علی کے گھر والے حیران وششدر تھے کہ علی آناًفاناً اتنا پیسہ کہاں سے لے آیا تھا۔ بہر حال علی نے اپنی تینوں بہنوں کا ایک ساتھ بیاہ کیا۔علی کے علاوہ بھی اس کے دو چھوٹے بھائی تھے۔جسونت نے شادیوں کے فوراًبعد بندہ بھیج کر اسے بلوالیا۔علی نے سب کو یہی بتایا کہ وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے گا۔علی جس وقت جسونت کے ہاں پہنچا وہ کچھ لوگوں کے ساتھ مصروف تھا۔علی کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ تھا۔وہ پہلے ہی جان چکا تھا جہاں جسونت بارود اور خودکش جیکٹیں رکھتا تھا۔علی نے وہاں سے ریموٹ کنٹرول بم اٹھائے اور ایک ساتھ چھ سات بم اسی کمرے میں لگا کر ریموٹ چھپالیا۔

دوسری طرف اسے نوید سنائی گئی کہ اسے ٹریننگ دینے کے لیے قافلہ آرہا ہے۔جلد ہی وہ لوگ پہنچ گئے اور انہوں نے علی کو بتایا کہ اس ایک پرہجوم علاقے میں اتار دیا جائے گا۔وہاں اسے خودکش دھماکہ کرنا ہے۔علی کو جیکٹ پہنادی گئی۔دوسری طرف علی نے ان سے نظریں چھپا کر دو بم اٹھالیے اور جاتے ہوئے گاڑی میں رکھ دیئے۔

جس وقت گاڑی علی کو اتار کر واپس جارہی تھی علی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔اس نے جیب سے ریموٹ نکالا اور بسم اللہ پڑھ کر اس کے بٹن دبا دیئے۔ایک ساتھ کتنے ہی دھماکے ہوئے۔جسونت اور اس کے سارے ساتھیوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔دوسری طرف علی کو چھوڑ کر جانے والی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے۔علی نے فوراًدریا کا رخ کیا۔دریا پر پہنچ کر اس نے جیکٹ دریا میں پھینک دی۔

اسے بے پناہ خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اسے حرام کی موت سے بچالیا تھا۔ بلکہ معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے والوں کو بھی اس نے کتے کی موت ماردیا تھا۔دوسری طرف اس کے گھریلو حالات بہت بہتر ہو گئے

تھے۔اس نے ان پیسوں سے نہ صرف اپنے لیے ایک عالیشان محل نما عمارت تعمیر کروائی بلکہ باقی ماندہ پیسوں کاروبار شروع کیا اور جلد ہی اس کا کاروبار اچھا چل پڑا۔علی اپنی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں ہمیشہ صدقہ نکالتا ہے اور ساری امت محمدیہ ﷺ کے لیے دعا کرتا ہے کہ سب کو ظالموں کے شر سے محفوظ رکھے۔علی کی طرح ہمیں بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں شیطانی،آسمانی،زمینی آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔شرِ انسان،شرِ شیطان سے بچائے رکھے۔ نبی کریم ﷺ کے دین کو ساری دنیا میں پھیلانے کی توفیق دے اور مرتے وقت کلمۂ طیبہ نصیب فرمائے۔(آمین)

☆......☆......☆

اهم اعلان

شاہین ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ اگست میں شائع ہوگا اور اس کے اندر ''آپ کے مسائل اوران کا حل''،''بیماریاں اوران کا علاج'' اور ''ستارے کیا کہتے ہیں؟'' قارئین کے لیے شامل کیے جارہے ہیں۔ اپنے مسائل،بیماریوں کے علاج اور ستاروں کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں ابھی سادہ کاغذ پر اپنے مسائل لکھ کرفوراً ارسال کریں۔ستاروں کے بارے میں جاننے کے لیے اپنا مکمل نام،والدہ کا نام اور تاریخ پیدائش لکھ کر بھیجنا لازمی ہے۔شکریہ

محمد ندیم عباس میواتی (ایڈیٹر شاہین ڈائجسٹ)



کیسے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹا یاد نہیں
''راہ محبت میں'' دل کس کس کا ٹوٹا یاد نہیں
ہے یاد مجھے میرے چاروں طرف بہت ہمدرد تھے میرے
کس نے لوٹا، کیسے لوٹا، کیوں لوٹا یاد نہیں

☆......☆......☆

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میلہ لگنے کی دیر تھی کہ لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ پہلے دن ہی سرکس کے تین شو دکھانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جھولے، بجلی پہ چلنے والی کشتیاں اور سیر و تفریح کے لیے نجانے کیسا کیسا سامان لایا گیا تھا۔ [illegible] کی آواز

اس شوروغل کومزید چار چاند لگائے ہوئے تھی۔

عبداللہ اوراس کے تینوں ساتھی یوسف، آفتاب اوراعجاز بھی میلے میں آئے ہوئے تھے۔آتے ساتھ ہی پہلے تو چاروں نے گرما گرم پکوڑے کھائے۔پھر چارون خواجہ سراؤں کاڈانس دیکھنے کے لیے ایک سائیکل گراؤنڈ کی طرف چل دیئے۔

خواجہ سراؤں کاڈانس دیکھنے کاسب سے زیادہ اشتیاق اعجاز کوتھا۔باقی سب تو سرکس دیکھنے کے متمنی تھے،لیکن وہ پیہم بضدتھا کہ تھوڑی دیرڈانس دیکھاجائے جب تک سرکس کاشوشروع نہیں ہوتا۔چاروناچارسب کوہتھیار ڈالنے پڑے۔بس پھرکیاتھا۔سب کےسمجھانے کے باوجوداعجاز خواجہ سراؤں کےساتھ اعجاز بھی ناچنے لگا۔

لوگوں کاجم غفیرمیلے میں جمع تھا۔کتنے ہی لوگ اعجاز کی حرکتوں کودیکھ رہے تھے جبکہ اعجاز ان سب کوپس پشت ڈالےمسخرے پن میں مصروف تھا۔دوسری طرف عبداللہ اوراس کے ساتھی اعجاز کومتواتراس سب سے منع کررہے تھے۔لیکن مجال ہے اس کے کانوں پرجوں تک رینگ جاتی۔اعجازباربارکسی نہ کسی خواجہ سراکوچھیڑرہاتھا۔تبھی اعجاز کی نگاہ ایک سائیڈپرناچتے ایک خواجہ سراہ پرپڑی جوعمر میں اٹھارہ بیس سال کاہی تھالیکن یوں لگ رہاتھاجیسےوہ خواجہ سراہ نہیں بلکہ حسین وجمیل دوشیزہ ہو۔

اعجازسیدھااس کے پاس پہنچ گیااوراسے چھیڑناشروع کردیا۔پہلےتووہ خواجہ سرابرداشت کرتارہالیکن جب اعجاز نے اس خواجہ سراہ کوپکڑکریکدم اپنی طرف کھینچااور گلے لگاکراس کے ہونٹوں کوچومابس پھرکیاتھا۔پلک جھپکتے میں لوگوں نے ہلہ گلہ مچادیا۔دوسری طرف سارے خواجہ سراہ سیخ پاہوگئےاورسب نےمل کراعجاز کی ایسی درگت لگائی کہ اسے چھٹی کادودھ یادآ گیا۔عبداللہ اوراس کےساتھیوں نے بڑی ہی مشکل سےاس کی جان بچائی اوراسے لے کرمیلے سے باہرکی طرف چل پڑے۔لوگ اعجاز کوتھوتھوکررہے تھے۔شرم کے مارے اعجاز پانی پانی ہو رہاتھا۔

اعجاز کی شرٹ اور بنیان خواجہ سراؤں نے ریزہ ریزہ کر کے رکھ دی تھی۔ یہی نہیں اس کے شریر پر خراشیں پڑ گئی تھیں اور چہرہ مار کھا کھا کے نہ صرف لال پیلا ہو چکا تھا بلکہ سوجن بھی پیدا ہو چکی تھی۔

اعجاز کی حالت دیکھنے والے اس پر متواتر فقرے کس رہے تھے۔ ''ہو'' ''ہا'' کے نعرے لگا لگا کر اسے مزید خجل خوار کر رہے تھے۔ اعجاز کے پورے جسم پر اور خاص کر چہرے پر سیاہ حلقے مترشح دکھائی دے رہے تھے جو کہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ اس کی اچھی خاصی حجامت ہوئی ہے۔ یہی نہیں اس کے دوست بھی اپنی ہنسی قابو میں نہیں کر پا رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھنے کی دیر تھی کہ وہ دوستوں پر ٹوٹ پڑا۔

''تم لوگ دوست نہیں میرے دشمن ہو۔'' اعجاز نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

اس کے بولنے سے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی کے ابھی وہ دھواں دھار رونا شروع کر دے گا۔

''واہ کیا بات کی ہے۔'' یوسف نے تنک کر کہا۔ ''ایک تمہیں ان جلادوں کے چنگل سے بریت دلائی اور الٹا ہم ہی دشمن ٹھہرے۔ دشمن تو تم خود ہی ہوا اپنے منع کرنے کے باوجود بھی جناب کو چین نہیں آیا تھا۔''

''بھلا تمہیں ضرورت ہی کیا تھی ہیرو پنتی کی......؟'' عبداللہ نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

عبداللہ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آفتاب جبکہ پچھلی نشستوں پر اعجاز اور یوسف براجمان تھے۔

''اس وقت تو اس نے کسی کی سنی بھی نہیں تھی۔ دیکھا کیسے ٹھمکے پہ ٹھمکے لگا رہا تھا۔'' آفتاب نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''بھلا تمہیں ضرورت ہی کیا تھی۔ ان خواجہ سراؤں سے پنگا لینے کی......؟''

''میں نے جو بھی کیا اچھا کیا۔'' اعجاز نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

''جیسی کرنی ویسی بھرنی۔'' عبداللہ نے ہنس کر کہا تو سب نے قہقہے بلند کیے جبکہ اعجاز منہ لٹکا کر چپ چاپ بیٹھا رہا وہ جانتا تھا کہ مزید بحث سے وہ اس کا زیادہ مذاق اڑائیں گے۔

☆☆☆

نادیہ کافی دن سے اپنی ماں سے بضد تھی کہ وہ اس کے ساتھ مارکیٹ چلے اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔اس کی ماں نے ایک دوبار تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اسے بتادے جو لینا ہے وہ خود لیتی آئے گی لیکن اس نے کچھ نہ بتایا اور بضد رہی کہ وہ ساتھ چلے گی۔

نادیہ کو بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا اشتیاق تھا۔اس کے والدین اس کی ہر ضد کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ نادیہ اور اس کا بھائی آریان دونوں میٹرک کے طالب علم تھے۔جبکہ نادیہ سے بڑا بھائی تبسم بی کام کررہا تھا۔

نادیہ اور عبداللہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔نادیہ شروع سے ہی عبداللہ میں کافی انٹرسٹڈ تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عبداللہ بہت آزاد خیال بندہ ہے۔نادیہ اور عبداللہ کا کال یا میسجز بھی اکثر و بیشتر رابطہ رہتا تھا۔نادیہ یہی سمجھتی تھی کہ عبداللہ بھی اس میں کافی انٹرسٹڈ ہے۔دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی بھی دلی خواہش تھی کہ عبداللہ از خود اسے پرپوز کرے جبکہ دوسری طرف عبداللہ اسے ایک اچھی دوست سمجھتا تھا۔اس نے کبھی اس کے بارے میں اس نیت سے نہ سوچا تھا جیسا کہ نادیہ سوچتی تھی جبکہ نادیہ ہر وقت اسی کے سپنے بُنتی رہتی تھی۔

اب بھی اس کا ماں کو مجبور کرنے کا اصل مقصد عبداللہ کے لیے گفٹ خریدنا تھا۔وہ عبداللہ کی سالگرہ پر اسے کوئی اچھا سا اور قیمتی گفٹ دینا چاہتی تھی۔نادیہ کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔وہ چاہتی تھی کہ عبداللہ کو کوئی ایسا گفٹ دے جو اس کے سب چاہنے والوں میں سے کسی نے نہ دیا ہو۔تبھی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ عبداللہ کو گولڈ رنگ گفٹ کی جائے۔

وہ جانتی تھی کہ یہ گفٹ کسی بھی صورت وہ ماں کے ہاتھوں نہ منگوا سکتی تھی جس کی وجہ سے اس نے ماں کو تنگ کرنا شروع کردیا تھا کہ اس کے ساتھ مارکیٹ جائے۔بالآخر ذکیہ بی بی کو اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔دونوں ماں بیٹی گاڑی میں مارکیٹ کی طرف چل پڑیں۔ڈرائیونگ سیٹ نادیہ نے سنبھال رکھی تھی جبکہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس کی ماں (ذکیہ بی بی) براجمان تھی۔

''ایسی بھی کون سی شاپنگ تم نے کرنی ہے جو مجھے نہیں کہہ سکتی تھی؟'' ذکیہ بی بی گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''بس تھوڑی سی جیولری خریدنی ہے اور مزید کچھ پسند آ گیا تو......'' نادیہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی ماں نے اسے ٹوکا۔

''ہمیشہ بچپنہ نہیں چلتا نادیہ۔'' ذکیہ بی بی ناک بسوڑتے ہوئے بولی۔

''اس سب کے لیے تم مجھے بھی کہہ سکتی تھی۔ اتنی ضد کر کے خود ساتھ چلنے کی ضرورت کیا تھی؟''

''ماں۔'' نادیہ برا مناتے ہوئے بولی۔

''میں اپنی پسند کی جیولری خریدنا چاہتی ہوں۔''

''پہلے تو میری پسند میں تمہیں کبھی اعتراض نہیں ہوا۔'' ذکیہ بی بی حیرت سے بولی۔

''چھوڑو بھی ماں۔'' نادیہ یوٹرن لیتے ہوئے بولی۔

''آخر اتنی جیولری کا تم نے کرنا کیا ہے......؟'' ذکیہ بی بی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میکے سے سارا کچھ اکٹھا کر کے سسرال لے جاؤں گی تاکہ وہاں جا کے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔'' نادیہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔'' ذکیہ بی بی بولی۔

''تمہیں ایسے سسرال والے ملیں گے جو تمہیں ہاتھ کے آبلے کی مانند رکھیں گے۔ تمہیں ہر جائز و ناجائز کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے۔''

''کاش ایسا ہی ہو۔'' نادیہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

دونوں مارکیٹ میں پہنچ چکی تھیں۔ مارکیٹ کے سامنے گاڑی پارک کر کے دونوں مارکیٹ میں داخل ہوئی۔ ان کا

رخ گلشن پلازے کی طرف تھا۔ سات منزلہ گلشن پلازے کے اندران گنت دکانیں تھیں۔ ضروریات زندگی کی ہر شے وہاں میسر تھی۔ وہیں نادیہ کے والد کے دوست کی جیولری کی دکان بھی تھی۔ دونوں ماں بیٹی چلتی ہوئی اس دکان میں داخل ہو گئیں۔

''السلام علیکم انکل!'' نادیہ نے دکان میں داخل ہوتے ہی دکان کے مالک سید فرحت حسین جو کہ اس کے باپ کا دوست تھا۔ اسے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' سید فرحت حسین نے زیر لب مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔

''جیتی رہو بیٹا۔ آج تو بڑے دنوں کے بعد دکھائی دی ہو۔ کہاں گم ہوتی ہو؟''

''میں تو کتنے دنوں سے آنے کے لیے ماں سے بضد تھی لیکن مجال ہے ان کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔'' نادیہ نے ماں کی شکایت کرتے ہوئے کہا تو ذکیہ بی بی زیر لب مسکرادی۔

''بہن جی دیکھ لیجیے ہماری بیٹی کبھی دروغ گوئی سے کام نہیں لیتی کیا یہ واقعی ٹھیک کہہ رہی ہے......؟'' فرحت حسین نے شکوہ کناں نگاہوں سے ذکیہ بی بی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دونوں ماں بیٹی دکان میں ایک طرف رکھی نشستوں پر براجمان ہو چکی تھیں۔

''ایکچوئلی میں ڈیلی روٹین سے مارکیٹ آتی ہوں۔ کئی بار تو اس سے پوچھا کہ مجھے ہی بتا دے کیا چاہیے مگر مجال ہے کہ کچھ بتا جائے۔'' ذکیہ بی بی نے بھی جواباً نادیہ کی شکایت کرڈالی۔

''بہن جی اب یہ بتائیں کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم......؟'' فرحت حسین شاہ نے پوچھا۔

''بھائی صاحب کسی بھی قسم کے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ذکیہ بی بی بولی۔

''لیکن میں ٹھنڈا پیئوں گی۔'' نادیہ نے جھٹ سے کہا تو ذکیہ بی بی نے اسے گھورا جبکہ فرحت حسین شاہ مسکرادیے۔

''تبسم۔'' فرحت حسین شاہ نے دکان پر ساتھ کام کرنے والے لڑکے کو مخاطب کیا۔

''جلدی سے دو ملک شیک بنوا کے لاؤ۔''

''بھائی صاحب رہنے دیں پلیز۔'' ذکیہ بی بی نے دوبارہ بات دہرائی۔

''کوئی بات نہیں بہن جی۔ موسم کافی گرم ہو چکا ہے۔ سورج سوا نیزے پر آگ برسا رہا ہے۔'' فرحت حسین شاہ بولے۔

''بس بھائی صاحب نہ دن کو سکون ہے اور نہ رات کو چین۔'' ذکیہ بی بی بولی۔

''لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے جینا محال ہو گیا ہے۔ حکمرانوں کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ نجانے کب اس ملک کے حالات بہتر ہوں گے؟''

''بہن جی یہ حکمران ہم خود ہی لے کے آتے ہیں۔'' فرحت حسین شاہ نے لقمہ دیا۔

''ہم لوگ وقتی طور پر دیکھتے ہیں کہ یہ کتنے اچھے ہیں۔ یہی اس ملک کو بہتر چلا پائیں گے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے اور ان کی اصلیت سامنے آتی ہے تو ہم گھٹنوں میں سر دے کر روتے ہیں۔''

قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی بولتا تبسم ملک شیک لے کر آ گیا اور دونوں ماں بیٹی کے سامنے رکھی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھ دیئے اور خود اپنی نشست پر جا کر براجمان ہو گیا۔ نادیہ موقع کا فائدہ اٹھا کر تبسم کے پاس پہنچ گئی۔

''تمہاری عمر کا ایک لڑکا ہے۔ اس کے لیے ایک گولڈ رنگ چاہیے۔ اچھی سی ہو۔ کسی کو بھنک نہ پڑے پیک کرنا اور ساتھ میں میرے لیے ایک اچھی سی رنگ پیک کر دینا۔'' نادیہ نے سرگوشی کے عالم میں تبسم کو کہا تو اس نے سر ہلا کر اسے جواب دیا اور نادیہ دونوں انگوٹھیاں دیکھ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

فرحت حسین شاہ اور اس کی ماں کے مابین ابھی تک ملکی حالات کے بارے میں بحث مباحثہ چل رہا تھا۔ نادیہ نے جیسے تیسے جلدی سے ملک شیک ختم کیا جبکہ دوسری طرف تبسم نے دونوں انگوٹھیاں ایک ہی ڈبے میں پیک

کر کے بل بنا کر کاؤنٹر پر پہنچا دیا۔ذکیہ بی بی نے بل ادا کیا اور اجازت لے کر دکان سے دونوں باہر آ گئیں۔

''اور بھی کچھ خریدنا ہے کیا......؟'' ذکیہ بی بی نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں کیوں نہیں۔'' نادیہ نے جواب دیا اور راہداری میں آگے آگے چلنے لگی جبکہ ذکیہ بی بی چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی۔

☆......☆......☆

میٹرک کا رزلٹ کیا آیا پورے گھر میں خوشیاں عود کر آ گئیں۔عبداللہ نے ہائی فرسٹ ڈویژن سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔عبداللہ کے ابو شہریار اسلم ایک سرکارے ادارے میں بطور کلرک خدمات سرانجام دے رہے تھے جبکہ اس کی ماں نمرہ فہیم ہاؤس وائف تھی۔عبداللہ کے والدین نے لو میرج کی تھی۔نمرہ فہیم کے والدین نے بلا چوں چراں رشتے کے لیے ہاں کردی تھی جس کی وجہ سے ''چٹ منگنی پٹ بیاہ'' کی رسم کے ساتھ ہی نمرہ فہیم شہریار اسلم کی اہلیہ بن کر اس کے گھر آن پہنچی تھی۔

شہریار اسلم کو نمرہ فہیم سے خالق کائنات نے چار پسران سے نوازا تھا جبکہ شدید خواہش کے باوجود وہ دختر جیسی عظیم نعمت سے محروم تھے۔شہریار اسلم کا سب سے بڑا بیٹا علی تھا۔جس نے ایم اے اسلامیات کیا تھا اور اتفاق سے فائنل ایئر کے اگزامز سے قبل ہی اسے ایک مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر کی سیٹ پر تعینات کردیا گیا تھا۔علی سے چھوٹا زین تھا۔جو کہ ایم کام کرنے کے بعد بینک میں جاب کر رہا تھا۔زین کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ ایک ایکٹر بنے اور اس سلسلے میں اس نے کتنی ہی پروڈکشنز اور ٹی وی اسٹیشنز کے چکر کاٹے لیکن سوائے منہ کی کھانے کے اسے کچھ نہ ملا۔یوں ایک زین کے اندر کا ایکٹر اس کے سینے میں دفن ہو کر رہ گیا۔جس کا اسے ہمیشہ ہی منکھ رہتا تھا۔

زین سے چھوٹا عاطف تھا۔اسے شروع سے ہی بیرون ملک جانے کی خواہش تھی۔ایف ایس سی کرتے ساتھ ہی اس

نے واویلا مچا دیا تھا کہ اگر وہ مزید تعلیم حاصل کرے گا تو فارن کنٹری جا کر دریں اثنا وہ مزید نہیں پڑھے گا۔
عاطف بچپن سے ہی کافی میچوئر اور ہارڈ ورکر بھی تھا۔ وہ صرف تعلیم کو اہمیت نہیں دیتا تھا بلکہ وہ پروفیشن لائف کو بھی بہت اہمیت دیتا تھا۔ وہ اپنے والدین یا بھائیوں پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم ٹیوشنز وغیرہ پڑھا لیا کرتا تھا۔ جس سے اتنا کچھ ہاتھ لگ جاتا تھا کہ اس کا خرچہ با آسانی چل جاتا تھا۔
عاطف کی ضد کے سامنے بالآخر سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ چنانچہ عاطف جلد ہی لندن پہنچ گیا۔ جہاں تھوڑی تگ ودو کے بعد اسے پارٹ ٹائم ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی سی جاب میسر آ گئی تھی۔ اس جاب سے نہ صرف وہ اپنے اخراجات بآسانی پورے کر سکتا تھا۔ بلکہ بہت کچھ بچا بھی سکتا تھا۔
سب سے چھوٹا عبداللہ تھا۔ جو سب کی آنکھوں کا تارا اور لاڈا تھا۔ چھوٹا اور لاڈلا ہونے کے ناطے اس کی ہر جائز و ناجائز کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے اس لاڈ پیار نے نہ صرف اسے بگڑنے سے بچایا ہوا تھا بلکہ وہ بہت ہی ذہین اور محنتی تھا۔
وہ ہمیشہ کلاس میں اول آتا تھا۔ میٹرک کے ایگزامز سے قبل اس کے ابو نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ میٹرک میں اعلیٰ پوزیشن کے ساتھ ساتھ اچھے مارکس لے گا تو اسے بطور تحفہ نئی موٹر سائیکل ملے گی۔ بھائیوں نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق دعوے کیے جبکہ اس کی والدہ نے اس کے فرسٹ آنے کی صورت میں اسے پارٹی دینے کا وعدہ کیا۔
چنانچہ وعدے کے مطابق اسے سب کچھ مل گیا۔ پارٹی بھی عظیم الشان ملی جس میں اس کے ٹیچرز، کلاس فیلوز کے علاوہ کچھ قریبی رشتے داروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ عبداللہ اس پارٹی سے بے حد خوش ہوا تھا۔ یہ پارٹی دراصل اس کے جذبوں کو ابھارنے کے لیے دی گئی تھی۔ وعدے کے مطابق اسے سب سے کچھ نہ کچھ ملا تھا۔ یہی نہیں عاطف نے لندن سے اس کے لیے لیپ ٹاپ بھیجا تھا۔

☆......☆......☆

انیلہ،نازیہ اورعالیہ بریک ہوتے ساتھ ہی کینٹین میں آ گئیں۔تینوں ایف ایس سی پارٹ ون کی سٹوڈنٹس تھیں۔انیلہ اورنازیہ دونوں خالہ زاد بہنیں تھیں جبکہ عالیہ ان کے گھر سے دوگلیاں چھوڑ کے تیسری گلی میں رہتی تھی۔اتفاق سے عالیہ کی دوستی ان کے ساتھ کالج میں آ کر ہوئی تھی۔تینوں ایک پرائیویٹ کالج سے ایف ایس سی کررہی تھیں۔

بریک ہوتے ساتھ ہی تینوں کینٹین میں ایک سائیڈ پر خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔کینٹین میں ان کے علاوہ بھی ان گنت طلباءوطالبات براجمان پیٹ پوجا کررہے تھے اور ساتھ میں خوش گپیوں میں بھی مصروف تھے۔ان تینوں کے بیٹھتے ساتھ ہی کینٹین میں کام کرنے والالڑکا جسے سب اس کے کالے رنگ کی وجہ سے کالو کہہ کر پکارتے تھے،آرڈر لینے آ گیا۔تین برگراورکولڈڈرنک کا آرڈر انیلہ نے دیااور کالو دبے قدموں واپس پلٹ گیا۔کینٹین کے اندرطلباو کے اونچابولنےاور قہقہے لگانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

''آج خیرتو ہےناں......؟''انیلہ نے عالیہ کوچپ دیکھ کر پوچھا۔

''تم کافی چپ چپ ہو۔کیابات ہےکوئی نئی افتادنازل ہوگئی ہے کیا؟''

''لگتاہے پھراس کانئے بوائے فرینڈ کے ساتھ کوئی مسئلہ بن گیاہے۔''نازیہ نے زیرلب مسکراتے ہوئے پیش گوئی کی تو عالیہ نے اسے کھاجانے والی آنکھوں سے گھورا۔

''تم نہ اپنی زبان کولگام لگا کررکھا کروسمجھی۔''عالیہ نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری پرسنل لائف ہے۔میری پرسنل لائف میں تمہیں انٹرفیئر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے یوانڈرسٹینڈ۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک ہےلیکن تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔''نازیہ نےبھنویں اچکا کرکہالیکن قبل اس کے کہ وہ اس

سے زیادہ کچھ بولتی عالیہ نے اسے چپ کروا دیا۔

''اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو کام آئیں گے تمہارے۔''

عالیہ کا غصہ عروج پر تھا۔

''کیا ہر وقت بچوں کی طرح آپس میں لڑتی رہتی ہو۔'' انیلہ نے تنگ آ کر لقمہ دیا۔

''ہر وقت آپس میں بچوں کی طرح تو تو میں میں لگائے رکھتی ہو۔ کبھی تو آپس میں اچھے لہجے میں بات کر لیا کرو۔''

قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی بولتا کالو ان کے سامنے برگر اور کولڈ ڈرنکس رکھ کر چلا گیا۔ انیلہ کن آنکھوں سے پیہم عالیہ کو تکے جا رہی تھی۔ پہلے کی نسبت آج وہ کافی اپ سیٹ اور کھوئی کھوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔

''سب خیریت تو ہے ناں......؟'' انیلہ نے عالیہ کو سوالیہ نگاہوں سے متواتر گھورتے ہوئے پوچھا جبکہ نازیہ دلچسپی سے عالیہ کو گھورنے لگی۔

اس کی آنکھوں سے شوخی عود کر آئی تھی لیکن وہ فی الوقت کوئی بات کر کے ماحول خراب نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ عالیہ ارم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتی تھی۔

''بس یار کیا بتاؤں......!'' عالیہ ارم نے متواتر کھوئے ہوئے اور پریشان لہجے میں کہا۔

''وہ محمود ہے ناں اس نے مجھ سے مکمل بائیکاٹ کر کے سینیئر کلاس کی سٹوڈنٹ انوشہ سے مراسم بنا لیے ہیں۔ یہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' انیلہ کے بولنے سے قبل ہی انیلہ نے فٹ لقمہ دیا۔ ''تم بھی تو آئے دن بوائے فرینڈ بدلتی رہتی ہو اگر اس نے تمہیں بدل دیا ہے تو اس میں بھلا پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم پھر کوئی نیا بوائے فرینڈ تلاش کر لینا۔''

بس نازیہ کا اتنا کہنا تھا کہ عالیہ ارم بھڑک اٹھی۔

''میں تمہیں چالولڑکی یا کوئی کوٹھے والی معلوم ہوتی ہوں کیا؟'' عالیہ ارم کے لہجے میں سختی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عودکرآنے والے گوہر ہائے آبدار دونوں سے پنہاں نہ تھے۔

''تم کیا سمجھتی ہو میں یہ سب شوق سے کرتی ہوں یا میرا پیشہ ہے۔ میں کوئی غریب لڑکی نہیں ہو کہ امیر لڑکوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان سے پیسہ بٹورنا شروع کردوں۔''

اتنا کہہ کر عالیہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تواتر کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ انیلہ نے اسے روکنا چاہا لیکن بے سو۔ انیلہ نے کھا جانے والی آنکھوں سے نازیہ کو گھورا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عالیہ کے پیچھے کینٹین سے باہر نکل گئی۔

سب کی نگاہیں نازیہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ عالیہ جاتے جاتے بولی ہی اتنی تیز آواز میں تھی کہ سب نے چپ سادھ کر اس کی باتیں سننا شروع کردی تھیں۔ نازیہ کو اپنے الفاظ کا احساس ہوا تو اسے چنداں خجالت محسوس ہوئی۔ اس نے اشارہ کر کے کالو کو بلایا اور بل ادا کر کے سب کچھ چھوڑ چھاڑ ان دونوں کے پیچھے وہ بھی کینٹین سے باہر نکل گئی۔ اس کے نکلتے ساتھ ہی کینٹین میں ان تینوں کے بارے میں چہ میگوئیاں اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔

☆......☆......☆

نادیہ کو جب پتہ چلا کہ عبداللہ نے میٹرک میں ہائی فرسٹ ڈویژن حاصل کی ہے تو اسے خاصی خوشی ہوئی۔ ایک ساتھ اس کے لیے دو خوشیاں تھیں۔ ایک عبداللہ کا اچھی پوزیشن سے میٹرک کا امتحان پاس کرنا اور دوسرا اس کی سالگرہ کا قریب آنا۔ نادیہ نے ماں سے دوست کے ہاں جانے کی اجازت لی اور گاڑی میں آن دبکی۔ پھر گاڑی گھر سے باہر نکالتے ہوئے اس نے عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا۔ عبداللہ نے فوراً ہی کال پک کر لی۔

''السلام علیکم۔'' عبداللہ نے کال ریسیو کرتے ساتھ ہی سلام دیا۔

''وعلیکم السلام۔'' نادیہ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''عبداللہ کہاں ہو تم؟''

''میں مارکیٹ جا رہا ہوں بائیک پر کچھ شاپنگ کرنی تھی۔'' عبداللہ نے بتایا۔

''اچھا ایسا کرو میں گلبرگ سے ابھی نکلی ہوں تم فوراً کے ایف سی میں آ جاؤ۔'' انیلہ نے مین مارکیٹ کے گول چوک کا چکر کاٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں دونوں کے ایف سی میں براجمان تھے۔ نادیہ نے جامنی کلر کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جس میں اس کا حسین و جمیل مکھڑا گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نکھر آیا تھا۔ عبداللہ بار بار اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

''سنا ہے تم نے میٹرک میں ہائی فرسٹ ڈویژن حاصل کی ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' عبداللہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''جانتے ہو آج تمہاری سالگرہ بھی ہے؟'' نادیہ نے انکشاف کیا تو عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''اس لیے ایک ساتھ دو دو مبارک باد کے مستحق ہو تم۔''

''لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ آج میری سالگرہ ہے۔'' عبداللہ نے بتایا

''بہر حال تمہیں مبارک ہو۔'' نادیہ نے کہا۔

''بس صرف مبارکباد دینی تھی کیا؟'' عبداللہ نے بھنویں سکیڑتے ہوئے مصنوعی ناگواری کا مظاہرہ کیا۔

''نہیں تو۔'' نادیہ نے جھک کر کہا اور پرس میں سے پیک کی ہوئی رنگ والی چھوٹی سی ڈبیہ عبداللہ کو تھما دی۔ ''یہ

میری طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔''

عبداللہ نے حیرت سے اسے پکڑتے ہوئے دیکھا اور پھر اس ڈبیہ کے اوپر کی گئی پیکنگ اتا دی۔ڈبیہ کو کھولا تو اسے کافی حیرت ہوئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ گولڈ رنگ ہے اور کافی بیش قیمت ہے۔

''ارے یہ کیا......؟''عبداللہ نے آنکھیں پھاڑ کر گولڈ رنگ کو دیکھتے ہوئے نادیہ سے پوچھا۔

''میں تو جسٹ مذاق کر رہا تھا لیکن تم تو حقیقت میں گفٹ لے آئی وہ بھی اتنا مہنگا۔''

نادیہ کو اس کا یہ انداز بھی پیارا لگا تھا۔وہ اس کا یہ انداز دیکھ کر زیر لب مسکرا دی تھی۔

''تو کیا ہوا عبداللہ۔''نادیہ نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔''یہ گفٹ تم سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے۔''

نادیہ کی بات عبداللہ کی سمجھ سے بالاتر تھی لیکن پھر بھی اس نے نہ سمجھنے کے باوجود سوالیہ نگاہوں سے نادیہ کو دیکھا جو دونوں ہاتھوں کی کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے ہوئے تھی۔اور اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی بنی جھولی میں رکھ کر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔عبداللہ کو نادیہ کا اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا عجیب سا لگا لیکن وہ اسے یوں اس طرح دیکھتے ہوئے شرما سا گیا جبکہ نادیہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

☆......☆......☆

ملک یوسف کا تعلق یک عزت دار اور کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔اس کا باپ ملک ذیشان مڈل سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ایمانداری اس کا شیوہ اور رزق حلال کمانا وہ اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔اس نے آج تک حرا کو گھر کی دہلیز تک نہ دکھائی تھی۔

ملک یوسف کی والدہ فریحہ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن آگے پڑھنے کی اجازت نہ مل سکنے کی بنا پر اسے تعلیم کو خیر آباد کہنا پڑا۔فریحہ ذیشان کو بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کی لگن تھی لیکن اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں لڑکیوں کی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

فریحہ کے سکول جانے پر جب پہلی بار پابندی عائد کی گئی تھی تو اس وقت وہ آٹھویں کلاس کے ایگزامز سے فری ہوئی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اس کے والدین اس کو مزید پڑھنے دیں لیکن پہلے تو انہوں نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی کہ یہ ناممکن ہے مگر فریحہ ذیشان نے بھی ہتھیار نہ ڈالے اور آخر اس کی ضد کے سامنے اس کے والدین کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور روتے پڑتے اسے میٹرک کرنے کی اجازت مل گئی۔ میٹرک کے بعد بھی اس نے لاکھ سعی کی لیکن پھر تو جیسے چار دیواری کی زنجیریں اس کے پیروں میں جکڑ دی گئی تھیں۔

اس دن وہ بہت روئی تھی۔ جب اس کے سکول جانے پر پکی پکی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اس کے ابا نے حکم جاری کر دیا تھا کہ اگر اس گھر میں اب دوبارہ تعلیم کا نام لیا گیا تو فریحہ ذیشان کی ماں کو طلاق دے کر دونوں ماں بیٹی کو گھر سے فارغ کر دے گا۔ یہ حکم سنتے ساتھ ہی جیسے فریحہ ذیشان کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی بولتی بند ہو گئی اور اس نے حالات کے سامنے ہار مانتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

فریحہ ذیشان اپنے باپ کی ضد سے بخوبی آشنا تھی۔ اسی لیے اس نے مزید کوئی بحث و مباحثہ کرنا بہتر نہیں سمجھا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر روئی تھی اور اپنی قسمت پر شکوہ کرتی رہی تھی کہ اس نے اس گھر میں آنکھ ہی کیوں کھولی جہاں ہر طرف پابندیاں ہی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ جہاں عورت صرف مرد کے اشارے کی منتظر ہوتی ہے اور اس کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی کیونکہ اسے اس کی پہچان کوئی بنانے ہی نہیں دیتا۔

یہ آنسو اس پر ڈھائی گئی مصیبت کا ازالہ تو نہیں کر سکے لیکن خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اس دن فریحہ ذیشان نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اور خاص کر بیٹیوں کو زیور تعلیم سے ضرور روشناس کروائے چاہے اس کے سامنے کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ کھڑی کر دی گئیں، کتنے ہی جتن کیوں نہ کاٹنے پڑ گئے۔ (جاری ہے)

☆......☆......☆

ملک این اے کاوش اعوان......رحمت کالونی، تحصیل سلانوالی، ضلع سرگودہا، پنجاب پاکستان



''وہ ۔۔۔۔وہ گلبہار ہے۔۔۔۔میری گلبہار۔۔'' میں اس شاپنگ مال کی دوسری منزل پر ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا گراؤنڈ فلور پر نظر جمائے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جب۔۔ جب گلبہار پر میری نظر پڑی وہ بہت سے شاپنگ بیگ سنبھالے شاپنگ مال کے مرکزی دروازے سے باہر نکل رہی تھی میں نے گلبہار کو زور سے آواز دی مگر شاپنگ مال میں بہت شور تھا لہذا میری آواز اس تک نہیں پہنچی میں زینے کی جانب لپکا اور دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتے ہونے زینہ اترا اور دوڑتا ہوا شاپنگ مال کے دروازے تک پہنچا میرے اس طرح دوڑنے سے کئی لوگوں کی آنکھوں میں شک کی لہر ابھری امریکا میں کسی مسلمان اور خاص طور پر پاکستانی مسلمان اگر اس طرح کسی رش والی جگہ سے بھاگتا ہوا نکلے تو لوگوں کو شک ہوتا ہے کہ کہیں یہ بم وغیرہ تو رکھ کر نہیں بھاگ رہا ہے۔

جب میں شاپنگ مال کے مرکزی دروازے سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا گلبہار سڑک پار کر کے ایک سفید کار میں بیٹھ چکی ہے جب تک میں سڑک پار کرتا گلبہار کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جا چکی تھی میں ۔۔۔ میں پچھلے پانچ سال سے امریکا میں گلبہار کو دیوانوں کے طرح تلاش کر رہا تھی اور اب ۔۔ اب وہ میری اتنے قریب آ کر نکل گئی میں نے پریشانی کے عالم میں سڑک پر ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائی اسی وقت مجھے ایک ٹیکسی آتی نظر آئی میں نے اسے ہاتھ دکھایا تو ٹیکسی میرے قریب آ کر رک گئی میں جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

''اس سفید کار کا پیچھا کرو۔۔۔'' میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی تیزی کے ساتھ ڈرائیور کو سڑک پر جاتی سفید کار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

''کیا بات ہے باؤ جی کوئی لفڑا تو نہیں ہے۔۔؟'' ٹیکسی ڈرائیور جو سکھ تھا بولا

''جلدی کرو یار۔۔۔ کوئی لفڑا نہیں ہے۔۔ یہ پیار کا چکر ہے اس کار میں میری بیوی ہے جسے میں کھو بیٹھا تھا۔۔۔'' میں نے جلدی جلدی کہا

''اوہ باؤ جی۔۔۔ پیار کا چکر ہے تو پھر اس سردار کی رفتار دیکھو۔۔'' اتنا کہہ کر سردار نے ٹیکسی کو گیئر میں ڈالا اور ٹیکسی تیزی کے ساتھ سفید کار کے پیچھے چلدی۔

☆......☆......☆

''آہ۔۔۔ سات سال بعد میں نے گلبہار کو دیکھا تھا وہ تھوڑی فربہ ہو گئی تھی مگر اس کی دلکشی اور رعنائی اسی طرح برقرار تھی جیسے پہلے دن تھی ۔ ۔۔۔ گلبہار میری زندگی۔۔۔ میری محبت ۔۔ میرا جنون۔۔۔ میری پیاری بیوی۔۔ جسے میں نے سات سال پہلے کھو دیا تھا مجھے آج تک یاد ہے جب میں پہلی بار گلبہار سے ملا تھا۔۔'' میں یادوں میں کھونے لگا۔

میں پشاور یونیورسٹی میں اردو شاعری پڑھاتا تھا میر، غالب سے لے کر احمد فراز کے شعروں کے نئے نئے مطالب

نکالتا تھا اسی لئے میں طالبعلموں میں کافی مقبول تھا۔ یونیورسٹی ہی میں میرا ایک کولیک میرا بہت اچھا دوست بن گیا مہروز خان میرا اکلوتا اور نہایت قابلِ اعتماد دوست تھا وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا چونکہ میرا گھر شمالی وزیرستان میں تھا اور میں پشاور میں ایک ہوسٹل میں رہائش پذیر تھا لہذا مہروز ضد کر کے روزانہ مجھے اپنے گھر لے جاتا اور میں رات کا کھانا کھا کر ہوسٹل آتا تھا۔

ایک دن اپنی کلاس ختم کر کے میں مہروز سے ملنے اس کے کمرے میں پہنچا جب میں مہروز کے کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رک گیا کیونکہ مہروز کے کمرے میں مہروز نہیں تھا بلکہ ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی لانبا قد، گھنگھرو والے سنہری بال، ستواں ناک، باریک ہونٹ غرض وہ لڑکی غالب کے اشعار کی مکمل تشریح نظر آ رہی تھی۔

میں کمرے میں داخل تو ہو گیا مگر کمرے میں اکیلی لڑکی کو دیکھ کر گھبرا گیا۔۔'' معاف کیجئے گا میں مہروز سے ملنے آیا تھا۔۔۔۔'' میں نے گھبرا کر کہا

''مہروز کہاں ہے۔۔'' کچھ دیر بعد میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا

''آپ زوار خان ہے؟۔۔'' اس لڑکی نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے ہی سوال کر ڈالا

''جی ہاں۔۔ مگر آپ۔۔۔'' میں جواب دینے کے بعد سوالیہ لہجے میں پوچھا

''میرا نام گلبہار خانم ہے میں امریکا سے آئی ہوں اور مہروز میرے فرسٹ کزن ہے۔۔'' گلبہار نے اپنا مکمل تعارف کروایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔۔'' تھوڑی دیر بعد جب ہم دونوں کے درمیان سے تکلف کی دیوار ہٹی تو میں نے سوال کیا

''میں جب سے آئی ہوں۔۔ مہروز نے آپ کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ۔۔ میں بناء دیکھے ہی آپ کو پہچان گئی۔۔'' گلبہار نے ہنستے ہوئے جواب دیا اس کی ہنسی بہت خوبصورت تھی۔

پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے بہت جلد ہم دونوں دوست بن گئے گلبہار نے بتایا کہ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تو اس کے والدین امریکا چلے گئے تھے گلبہار نے اپنی ساری ایجوکیشن امریکا ہی میں حاصل کی پھر ہم دونوں امریکا اور پاکستان کی ایجوکیشن کا تقابلی جائزہ لیتے رہے

''گلبہار۔۔'' میں نے گلبہار کو مخاطب کیا۔۔۔'' آپ کا نام گلبہار بہت بڑا ہے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت دور بیٹھا ہو۔۔۔اگر آپ برا نہ مانے تو آپ کو گل کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں۔۔'' میں نے تکلفات کے پردے کو انتہائی بے تکلفی سے اتارنا چاہا

''نام تو آپ کا بھی بہت بھاری سے زاوار خان۔۔۔اگر میں آپ کو زری کہوں تو۔۔آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔۔''

''قطعی نہیں۔۔۔آپ شوق سے مجھے زری بول سکتی ہے۔۔''

''پھر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔۔۔آپ شوق سے مجھے گل کہہ سکتے ہیں۔۔۔ بلکہ مجھے یہ نام اچھا لگا مجھے آج تک کسی نے گل کہہ کر نہیں پکارا ''

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور مہروز کمرے میں داخل ہوا۔

''معاف کرنا دیر ہو گئی ذرا وائس چانسلر کے آفس تک گیا تھا۔۔'' اتنا کہہ کر مہروز اپنی کرسی پر بیٹھ گیا پھر تھوڑا توقف کرنے کے بعد بولا

''میرا خیال ہے آپ دونوں نے تعارف تو حاصل کر لیا ہو گا پھر بھی میں یہ فرض پورا کیئے دیتا ہوں۔۔یہ میری کزن ہے گلبہار خانم۔۔۔امریکا سے آئی ہے اور پاکستان گھومنا چاہتی ہے۔۔'' مہروز نے گلبہار کا تعارف مجھ سے کرایا پھر گلبہار کی جانب متوجہ ہو کہنے لگا۔

'' اور یہ ہے زوار خان۔۔یہاں بچے کو پیار و محبت سکھاتے ہیں ۔۔مطلب انہیں اردو شاعری پڑھاتے

ہیں۔۔۔ویسے یہ فیوڈل لارڈز ہے۔۔'' مہروز نے میرے متعلق گلبہار کو بتایا

''فیوڈل لارڈز۔۔۔ان کے متعلق تو سنا ہے کہ وہ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔۔'' گلبہار میرے متعلق سن کر بولی

''مہروز مذاق کر رہا ہے۔۔میرے والد صاحب بہت چھوٹے سے زمیندار ہے۔۔۔'' میں نے مسکرا کر گلبہار سے کہا

اس دن ہم تینوں یونیورسٹی کے تمام ڈپارٹمنٹس گھومتے رہے ہم تینوں نے یونیورسٹی کی کینٹین میں ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا اور بڑی دلچسپ باتیں کیں گلبہار کی معلومات حیرت انگیز تھی اسے ہر موضوع پر عبور حاصل تھا وہ ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی پھر میرا یہ روز کا معمول ہو گیا کہ یونیورسٹی کے بعد ہم تینوں گھومنے نکل جاتے۔پشاور کے تمام اہم مقامات ہم نے دیکھے پھر میں نے اور مہروز نے یونیورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور گلبہار کو شمالی علاقہ گھمانے لیکر گئے شمالی علاقوں کی خوبصورتی دیکھ کر گلبہار دنگ رہ گئی بقول گلبہار کے اتنے خوبصورت مقامات دنیا میں کہیں نہیں ہیں جو اللہ نے پاکستان کو دیئے ہیں مگر ہم ان مقامات کی قدر نہیں کر رہے اگر ہم ان ایریاز کو ڈیولپ کر لے تو پاکستان سیاحت کے ذریعے کثیر زرِمبادلہ کما سکتا ہے۔

ایک مہینہ گلبہار کی سنگت میں کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔میں محسوس کر رہا تھا کہ گلبہار کے لئے میرے دل میں خاص جذبات امنڈ رہے ہیں۔اتنی شدید تڑپ اور چاہت میں نے کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی تھی گلبہار خوشبو کی طرح میرے وجود پر چھا گئی تھی پھر جب ایک ماہ بعد گلبہار کے واپس جانے کے دن قریب آنے لگے تو ایک دن گلبہار کو تنہا پا کر میں نے اس سے کہا

''تم پاکستان میں نہیں رک سکتی۔۔۔؟''

''پاکستان میں رکنے کی کوئی وجہ ہونی چاہئے '' گلبہار نے جواب دیا

''گل۔۔۔کیا وہ وجہ میں نہیں بن سکتا۔۔؟ '' میرا لہجہ بدستور سوالیہ تھا

''کیا مطلب۔۔'' گلبہار سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن رہی تھی

''میں زندگی کا سفر تمہارے ساتھ طے کرنا چاہتا ہوں۔۔'' میں نے کھل کر اظہار کیا تو اس نے رضا مندی سے اپنا سر جھکا دیا

مجھے ایسا لگا زندگی کی اندھیری راہداری میں میٹھی میٹھی چاندنی پھیل گئی ہو۔۔ ہر جانب پھول کھل اٹھے فضا مسکرانے لگی اور۔۔اور مجھے دنیا خوبصورت نظر آنے لگی۔

گلبہار کا اقرار سن کر میں نے فوراً ابا اور اماں بی کو گاؤں سے بلایا گلبہار کے والدین بھی امریکا سے پشاور آ گئے۔ہماری شادی میں کہیں سے کوئی رخنہ نہ ڈالا گیا اور ایک شام نکاح کے دو بولوں کے ذریعے ہم دونوں ایک ہو گئے ہماری شادی بہت دھوم سے ہوئی۔۔شادی کے بعد میں اور گلبہار ہنی مون کے لئے ماریشس گئے وہ میری زندگی کے یادگار دن تھے ہم دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے میں کھوئے رہتے تھے۔

ہماری شادی کے دو ماہ بعد ایک دن ابا جان کا فون آیا کہ اماں بی کی طبیعت بہت خراب ہے یہ سن کر میں پریشان ہو گیا کیونکہ ان دنوں ملک کے حالات بھی کافی خراب تھے نائن الیون کا واقعہ ہو چکا تھا امریکا نے افغانستان میں فوجیں اتار دی تھیں میرا گاؤں پاکستان اور افغانستان کی سرحد پر ہونے کی وجہ سے کافی خطرات میں گھیرا ہوا تھالہذا ایسے حالات میں، میں نے گلبہار کو گاؤں لے جانا مناسب نہیں سمجھا اور اسے مہروز کی والدہ کے پاس چھوڑ کر خود گاؤں روانہ ہو گیا گاؤں پہنچا تو دیکھا کہ اماں بی بالکل غنودگی کے عالم میں تھی انہیں کوئی سدھ بدھ نہ تھی میں نے ابا جان کو راضی کیا کہ وہ اماں بی کو لیکر میرے ساتھ پشاور چلے ابا جان اماں بی کی حالت کے پیشِ نظر راضی ہو گئے ہم نے سب تیاریاں کرلیں کہ صبح پشاور کے لئے نکل جائیں گے مگر۔۔مگر افسوس انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے جس صبح ہمیں پشاور کے لئے نکلنا تھا اسی رات امریکن طیاروں نے گاؤں پر بمباری کر

دی اور پورے گاؤں کو تہس نہس کر ڈالا صرف یہی نہیں بلکہ ان کی زمینی فوج بھی گاؤں میں داخل ہوگئی اور بمباری سے زندہ بچ جانے والوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی ان گرفتار ہونے والوں میں، میں بھی شامل تھا۔ پورے دو سال میں امریکیوں کے عقوبت خانوں میں رہا۔ امریکی عقوبت خانے جہنم کی زمینی شکل تھے وہاں انسان کو ٹارچر کرنے کے کون کون سے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

دو سال بعد ایک این جی او کی کوششوں سے مجھے اور چند دوسرے بے گناہوں کو رہائی ملی دو سال بعد جب میں نے اپنے پاک وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تو میرا رواں رواں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا امریکیوں کی قید سے رہائی پر میں بہت خوش تھا مگر ابھی میرے آزمائش کے دن ختم نہیں ہوئے تھے۔ پشاور آ کر مجھے گلبہار کا کوئی پتا نہیں چل سکا مہروز کے گھر گیا تو وہاں سے معلوم ہوا کہ مہروز کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور مہروز امریکا چلا گیا گلبہار کے متعلق بھی یہی معلوم ہوا کہ میرے غائب ہونے کے بعد وہ امریکا چلی گئی لہذا میں نے امریکا میں گلبہار کے والدین سے رابطہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ایک ایکسیڈنٹ میں گلبہار کے والدین کا بھی انتقال ہو گیا اور گلبہار والدین کے انتقال کے بعد وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی گئی تھی لہذا میں گلبہار کی تلاش میں امریکا آ گیا یہاں میں نے گلبہار کی تلاش شروع کی مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی میں دیوانوں کی طرح گلبہار کو امریکا بھر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور آج۔۔۔آج گلبہار مجھے نظر آ گئی۔

سفید کار ایک مکان کے دروازے پر رکی اور گلبہار کار سے نیچے اتری اور اس نے شاپنگ بیگ اٹھائے اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی گلبہار کی کار کے پیچھے روکی میں نے شکریے کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور کا کرایہ ادا کیا اور دوڑتا ہوا اس مکان کے دروازے تک پہنچا جس میں گلبہار داخل ہوئی تھی دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے نہایت بے صبری سے ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

''کون ہے۔۔؟'' اندر سے گلبہار کی آواز سنائی دی برسوں بعد گلبہار کی آواز سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل سینہ توڑ

Downloaded from https://paksociety.com

کر باہر آجائے گا۔

''گل۔۔۔'' میں نے دھیرے سے اسے پکارا میری آواز کے ساتھ ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

''زوار۔۔۔آپ۔۔۔آپ زندہ ہے۔۔'' دروازے میں کھڑی گلبہار حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔میں نے گلبہار کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا میری آنکھیں نم ہورہی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ گلبہار کو گلے سے لگالو اور خوب جی بھر کر آنسو بہاؤ۔۔مگر میں نے اپنی خواہش کو دل ہی میں دبا کر رکھا۔

''آپ۔۔آپ۔۔اتنا عرصہ کہاں تھے زوار۔۔۔'' گلبہار سسک سسک کر رونے لگی۔

''کیا ساری باتیں دروازے پر ہی کرتی رہو گی اندر نہیں آنے دو گی۔۔'' میں نے کہا تو گلبہار دروازے سے ہٹ گئی میں گھر کے اندر داخل ہوا گلبہار نے دروازہ بند کیا اور میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اب میں اپنی خواہش کو دبا نہیں سکا اور میں نے گلبہار کو اپنے بازؤوں میں بھینچ لیا۔گلبہار نے تڑپ کو خود کو میری بانہوں کے حلقے سے نکالا میں نے حیران نظروں سے گلبہار کو دیکھا۔

''ماما۔۔۔ماما۔۔آنٹی گندی ہے۔۔۔'' اسی وقت دو سال کی ایک معصوم بچی کمرے میں داخل ہوئی اس کے پیچھے شائد اس کی آیا تھی۔

''ماما۔۔۔ماما۔۔دیکھئے نا آنٹی کو۔۔۔'' بچی گلبہار سے لپٹ گئی گلبہار نے بچی کو گود میں اٹھا لیا میں حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''بری بات ہے گڑیا۔۔بڑوں کو ایسا نہیں بولتے۔۔۔۔تم جاؤ۔۔'' گلبہار نے پہلے بچی سے کہا پھر آیا کی جانب گھوم کر اسے کمرے سے جانے کا کہا۔

''بیٹھ جاؤ زوار۔۔۔'' گلبہار کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن جب ماہپارہ کو گاڑی لینے پہنچی تو اس نے جانے سے انکار کر دیا کہ وہ بہت بیمار ہے کام نہیں کر سکتی جب واپس جا کر ڈرائیور نے بتایا تو زین حمادی کو شدید غصہ آیا اس نے دل میں سوچا ایسے لوگوں کو ذرا سی عزت کیا دو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں غصے سے چابی لے کر ماہپارہ کے گھر چلا گیا اُس کے گھر پہنچا تو ماہپارہ کی خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا وہ باچھیں کھلائے آ کر زین حمادی کے ساتھ بیٹھ گئی اب زین حمادی غصے میں بڑبڑا رہا تھا مگر اب وہ کسی بھی قسم کا رِسک نہیں لینا چاہتا تھا ورنہ زین حمادی تو وہ تھا جس سے بڑی بڑی ماڈلز مہینوں پہلے اپوائنمنٹ لیتی تھیں لیکن اس وقت تو ماہپارہ بھی زین حمادی کی جیت کا آسان اور واحد رستہ تھی یہی وجہ تھی جو وہ اس کے گھر تک جا پہنچا تھا مگر اب اس نے سوچ لیا کہ وہ کام جلد سے جلد ختم کرے گا اور پھر سے اس کی شکل کبھی نہیں دیکھے گا ،وہیں ماہپارہ سمجھ رہی تھی کہ زین حمادی جیسے انسان کو اُس سے لگاؤ ہونے لگا تھا وہ بہت خوش تھی اور دِل و جان نچھاور کرنے کو تیار تھی کچھ دیر میں وہ اسٹوڈیو پہنچ گئے زین حمادی نے ٹھان لی تھی کہ وہ آج ہی کام ختم کر لے گا اُس نے ماہپارہ کہ نہایت دھیمے لہجے میں کہا کہ آج ہم ساری رات کام کریں گے اور میں تمھیں پچیس ہزار دوں گا ماہپارا کی تو خوشی کا ٹھکانہ ہی نہیں تھا وہ تو ویسے بھی زین حمادی کی قربت میں رہنا چاہتی تھی زین حمادی نے رات میں ہی مختلف بیک گراؤنڈ اور کاسٹیومز میں بہت سے منفرد پوزز میں شوٹ لیے سورج طلوع ہو رہا تھا کام مکمل ہو چکا تھا شینا نے پچیس ہزار ماہپارہ کو تھما دیے اور بتا دیا کہ کام مکمل ہو گیا ہے کل سے اُسے آنے کی ضرورت نہیں یہ سنتے ہی ماہپارہ کا چہرا اُتر گیا اب وہ رو دینے کو تھی جاتے ہوئے زین حمادی نے اُسے ایک کارڈ دیا جو کسی ڈاکٹر کا تھا جو اُس کا مفت علاج کر سکتا تھا مگر ماہپارہ تو زین حمادی کے پاس رہنا چاہتی تھی کچھ دیر میں ڈرائیور اُسے لے کر چلا گیا زین حمادی اب اپنا تمام وقت اِن تصاویر کو سیٹ کرنے میں لگانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ۔۔یہ سب۔۔۔کیا ہے۔۔؟''میں نے بچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گلبہار سے پوچھا۔

''مجھے آپ کے مرنے کی خبر ملی تھی پورا گاؤں ملیا میٹ ہو گیا تھا طیاروں کی بمباری سے لاشوں کی پرخچے اڑ گئے تھے کسی لاش کی شناخت ممکن نہ تھی سرکاری طور پر آپ کی موت کا اعلان ہوا تھا۔'' گلبہار نے بولنا شروع کیا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بھی جاری ہوگئی معصوم گڑیا اپنی ماں کی گود میں بیٹھی حیران نظروں سے اپنی ماں کو روتا دیکھ رہی تھی۔

''آپ کی موت کی خبر نے میرے ذہن پر بہت منفی اثر ڈالا اور میں نیم پاگل سی ہوگئی۔پھر ماما پاپا مجھے امریکا لے آئے۔۔۔جب پشاور کے حالات بھی خراب ہونے لگے تو مہروز بھی امریکا آگئے پھر ماما پاپا کی ناگہانی موت نے مجھ پر بہت منفی اثر ڈالا اور میں موت کے دھانے پر آ کھڑی ہوئی مگر مہروز نے کسی ہمدرد کی طرح مجھے سہارا دیا اور زندگی کی جانب واپس لیکر آئے۔۔۔۔۔تین سال پہلے میں نے اور مہروز نے شادی کر لی۔۔۔اور یہ ہماری بیٹی ہے گڑیا۔۔'' اپنی بات کے آخر میں گلبہار کا لہجہ دھیما ہو گیا میں لرزتے بدن کے ساتھ گلبہار کی داستان سن رہا تھا۔

''مگر۔۔۔مگر آپ۔۔۔آپ اتنے سال کہاں رہے۔۔'' گلبہار نے مجھ سے پوچھا

''گاؤں پر بمباری کی بعد امریکن گاؤں میں زندہ بچ جانے والوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے ان قیدیوں میں ،میں بھی شامل تھا۔۔دو سال بعد میں امریکیوں کی قید سے رہا ہوا جب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔۔'' میں نے جواب دیا اسی وقت مرکزی دروازے کے کی ہول میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھلا۔۔۔۔اور کھلے دروازے سے مہروز اندر داخل ہوا مہروز کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر خاموش کھڑی گڑیا اچھل پڑی اور خوشی سے چیختی ہوئی مہروز کی جانب لپکی۔

''پاپا۔۔۔پاپا۔۔''

''میرا پیارا بیٹا۔۔'' مہروز نے گڑیا کو گود میں اٹھالیا

''گڑیا۔۔پاپا کی گود سے اترو۔۔۔'' گلبہار نے گڑیا سے کہا

''گل۔۔۔ہم باپ بیٹی کے معاملات میں مت بولو۔۔'' مہروز نے محبت پاش نظروں سے گلبہار کو دیکھتے ہوئے کہامہروز نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھااس کے منہ سے گلبہار کے لئے گل کا لفظ سن کر میں ساکت رہ گیا۔

''مہروز آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔۔'' گلبہار نے مہروز کے توجہ میری جانب دلائی تو مہروز نے گڑیا کو اپنی جیب سے چاکلیٹ نکال کر دی اور اسے گود سے نیچے اتارااور میری جانب متوجہ ہوااور مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئی وہ چیختا ہو مجھ سے لپٹ گیا اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے میری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔

''زوار۔۔۔میرے بھائی۔۔میرے دوست تو۔۔تو کہاں تھا۔۔''مہروز نے روتے ہوئے جملہ مکمل کیا

میں نے مختصراً اسے اپنی کہانی سنائی اور خاموش ہو گیا۔ہم تینوں کے درمیان بڑی تکلیف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا

سوچوں میں گم تھا پھر مہروز نے سر اوپر اٹھایااور تکلیف دہ انداز میں بولا

''زوار۔۔۔اگر مجھے تمہارے زندہ ہونے کا معلوم ہوتا تو میں کبھی گلبہار سے شادی نہ کرتا۔۔۔گلبہار تمہاری امانت ہے۔۔وہ تمہاری تھی تمہاری ہے اور تمہاری رہے گی۔۔۔''

مہروز کی بات سن کر گلبہار ایک بار پھر رونے لگی میں خاموشی سے سر جھکائے مہروز کی بات سن رہا تھا۔

'' زوار۔۔۔۔ویسے بھی تمہارے زندہ ہونے سے میرا اور گلبہار کا نکاح باطل ہو چکا ہے۔۔۔اللہ ہمیں اس گناہ پر معاف کرے۔۔۔۔گلبہار تمہاری ہے زوار۔۔۔'' مہروز نے لرزتی آواز کے ساتھ جملہ مکمل کیا۔مہروز کے ہر لفظ کے ساتھ گلبہار کے رونے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اب وہ باقاعدہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''ماما۔۔۔ماما۔۔مت روئیے۔۔پاپا۔۔۔۔پاپا دیکھئے ماما روری ہیں۔۔۔'' ننھی گڑیا نے اپنی توتلی زبان میں مہروز سے کہا وہ گلبہار کے رونے سے پریشان ہوگئی تھی۔

'' میں۔۔۔میں گلبہار کی زندگی سے چلا جاؤنگا۔۔مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم۔۔۔گڑیا کو باپ کا پیار دوگے۔۔'' مہروز انتہائی ضبط سے کام لے رہا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر میں نے آگے بڑھ کر گلبہار کے پاس کھڑی معصوم گڑیا کو گود میں اٹھایا اور اس کے گالوں پر پیار کرنے لگا گڑیا حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں میں گڑیا کو لیکر مہروز کے پاس آیا اور کہا۔

'' میں اس معصوم بچی سے اس کے ماں یا باپ کو جدا نہیں کرسکتا۔۔تم لوگوں نے مجھے مرا ہوا سمجھا تھا اور۔۔آج۔۔۔آج میں واقعی مر گیا۔۔۔تم دونوں خوش رہو۔۔۔سمجھ لینا آج تم دونوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔۔۔اللہ تم دونوں کو بہت ساری خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔۔'' میں نے گڑیا کو مہروز کی گود میں دیا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے

''زوار۔۔۔کچھ دیر تو رک جاؤ۔۔'' مجھے پیچھے سے مہروز کی آواز آئی میں نے مڑ کر ایک نظر گلبہار پر ڈالی جو مہروز کے ساتھ کھڑی گڑیا کو پیار کر رہی تھی۔

''نہیں میرے دوست۔۔۔میں جتنی دیر یہاں رہونگا۔۔۔سب کے لئے تکلیف کا باعث بنونگا۔۔لہذا میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔۔'' میں نے جواب دیا اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے، دروازے کے پاس پہنچ کر میں ایک لمحے کو رکا اور پھر میں نے مہروز کی جانب دیکھا اور سر جھکاتے ہوئے کہا

'' میں کل ڈاک سے طلاق نامہ بھیج دونگا۔۔پھر تم دونوں دوبارہ نکاح کر لینا۔۔تاکہ شرعی حجت بھی پوری ہو جائے گی۔۔'' اتنا کہہ کر میں نے دروازہ کھولا اور باہر اندھیرے میں گم ہوگیا۔

ضرغام محمود، مکان نمبر 233 فیز 3 معین آباد ماڈل کالونی، کراچی

فیس بک (خصوصی اشاعت)

تحریر: ماہ نور شہزادی...... گجرات

فیس بک آج کے دور کا سب سے بڑا مشغلہ ہے۔ ضرورت، مجبوری یا اپنوں کی قربت یا پھر نجانے کیا کیا ہمیں فیس بک کی دنیا پر میسر آتا ہے۔ اس بات کا کہانی پڑھنے والا اپنے حساب سے کرے گا۔ یہ کہانی میری سہیلی کی ہے۔ جس کی شادی کو ایک سال بیت چکا تھا۔

گھر میں نندیں، دیور، ساس اور سسر سب رشتے موجود تھے۔ ایک چھوٹی سی جنت جہاں سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سب میں بہت پیار تھا۔ فاروق کی شادی سے سب ہی بہت خوش تھے کیونکہ اس نے شادی بہت دیر سے کی تھی۔ پروفیسر بننے کے بعد اسے اپنے لیے کوئی ٹائم ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ فاروق اور نازش کی عمر میں بارہ سال کا فرق تھا۔ لیکن ان کی باتیوں، مشغلوں اور ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کبھی یہ احساس نہ دلا پاتا تھا کہ دونوں کی عمر میں کوئی تفاوت بھی ہے

Downloaded from https://paksociety.com

فاروق اپنی بیوی سے بھی زیادہ فیس بک کو ٹائم دیتا تھا اور اس کی اس حرکت کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان اکثر ان بن رہتی تھی۔

ایک دن اریبہ نامی لڑکی کی فرینڈ ریکوئسٹ اسے موصول ہوئی جسے فاروق نے فوراً ہی Accept کرلیا۔ پہلے تو رسمی سلام دعا ہوئی۔ پھر یہ سلام دعا اتنی بڑھتی چلی گئی کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست اور ہمراز بھی بن گئے۔

اریبہ ایک دیہاتی اور غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے حالات سے آگہی پر فاروق کو نجانے کیوں اس پر ترس آ گیا۔ وہ حتی المکان اس کی مدد کرنے کی کوشش بھی کرتا۔ کبھی نقدی، کبھی گفٹ نجانے کیا کیا اسے بھیج دیتا۔

اب فاروق نے پہلے سے زیادہ وقت فیس بک کو دینا شروع کیا تو نازش کے من کے مندر میں شک کی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئیں۔

سو دن چور کا اور ایک دن مالک کا کے مترادف ایک دن یہ راز نازش پر کھل گیا کہ اس کا خاوند کسی اریبہ نامی لڑکی سے فیس بک پہ بات کرتا ہے۔ یہی نہیں ان کے درمیان عشق وشق شروع ہو چکا ہے۔ اسے اس بات کا بے حد ملال ہوا۔ نازش نے جب اس بارے میں فاروق سے بات کی تو اس نے نازش کو جاہل، گنوار، بیوقوف، کم عاقل، کند ذہن اور نجانے کیسے کیسے القابات سے نواز دیا۔ نازش کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ رو دھو کر اس نے آنے والے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کمر کس لی تھی۔

دوسری طرف فاروق نے اریبہ سے تصویر مانگی۔ جب اریبہ نے اسے اپنی تصویر فیس بک پہ بھیجی تو فاروق اور بھی اس کا گرویدہ ہو گیا۔ دوسری طرف نازش اور فاروق کے درمیان نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ فاروق نے نازش کو طلاق دینے کا ارادہ کرلیا۔ نازش سے فاروق کو اولاد تو ویسے نہیں تھی تو یہ بہانہ اس سے جان چھڑوانے کا اسے کافی معقول لگا۔

فاروق کے گھر میں بھی ساری بات کھل چکی تھی۔ انہوں نے بھی فاروق کو سمجھانے کی بے پناہ کوشش کی لیکن اس

کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور اس نے بے گناہ نازش کو بلاوجہ طلاق دے ڈالی۔اس بات کو ابھی ایک ہفتہ نہ گزرا تھا کہ خالق کائنات نے نازش کے غموں کا مداوا کر دیا اور اسے ماں بننے کی نوید مل گئی۔

ادھر جب فاروق نے اریبہ سے شادی کا کہا تو اس نے جھٹ سے انکار کر دیا حالانکہ وہ پہلے بالکل رضامند تھی۔ فاروق نے اس کی خوب منت سماجت کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔حقیقت یہ تھی کہ اریبہ لڑکی تھی ہی نہیں بلکہ وہ ایک لڑکا تھا اور فاروق سے پیسے بٹورنے کے لیے اس نے اسے اپنے جال میں پھنسالیا تھا۔اس نے اریبہ کے نام سے ایک فیس بک اکاؤنٹ بنا رکھا تھا۔جس پر نجانے وہ کتنوں کو مورکھ بنا چکا تھا۔

اس لڑکے نے جب حقیقت سے فاروق کو آشنا کیا تو فاروق کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔دوسری طرف نازش کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی خوبصورت بیٹے سے نوازا تھا۔فاروق اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ سب کے سامنے کیا کہے کہ اسے ایک لڑکے نے بے وقوف بنا کر اس سے نجانے کیا کیا بٹور لیا ہے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت کے مترادف کیا ہو سکتا تھا۔

فاروق نے گھر والوں کی منت سماجت کر کے دوبارہ نازش سے شادی کر لی۔اب فاروق اور نازش کے تین بچے ہیں۔اس دن کے بعد آج تک فاروق نے کبھی فیس بک استعمال نہیں کی۔اگر اسے معلوم پڑ جائے کہ کوئی فیس بک استعمال کرر ہا ہے تو نجانے وہ اسے فیس بک استعمال نہ کرنے پر کتنے لیکچر دیتا ہے لیکن آج تک اس نے یہ راز کسی پر عیاں نہیں کیا کہ اس نے فیس بک کو کیوں چھوڑا اور اریبہ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟ جب بھی وہ تنہائی میں اریبہ نامی دغاباز کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے رگ و پے میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس نے کیسے دھوکے میں آکر اپنی اس بیوی کو طلاق دے ڈالی تھی جو اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور باوجود اس کی غلطیوں کے اس نے دوبارہ اسے اپنا لیا تھا۔کہانی پر اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☆......☆......☆